مطالعہ کے لائق ہیں،

ہندوستانی مسلمان پر ایک نظر:- مؤلفہ جناب مولانا سید ابو الحسن علی ندوی تقطیع بڑی ضخامت صفحات ۳۲، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد ہے پتہ ادارہ تحقیقات و نشریات اسلام دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ،

مولانا علی میاں کا قلم ہمیشہ رواں دواں رہتا ہے اور نئے نئے رنگ میں جلوہ دکھاتا ہے، ہندوستانی مسلمان انکی تازہ تصنیف ہے اس میں ان کی مذہبی و معاشرتی زندگی آداب و تہذیب رسم و رواج اور عادات و خصائل کا نقشہ دکھایا ہے، کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے، پہلے باب میں پیدائش سے لیکر بلوغ تک، دوسرے میں بلوغ سے موت تک کے رسوم، تیسرے میں تہذیب و معاشرت کا نقشہ چوتھے میں مذہبی تہواروں، پانچویں میں عبادات و فرائض کا ذکر چھٹے میں بعض مذہبی و ملی خصوصیات پر تبصرہ ہے جس سے اسکا ہر رخ سامنے آجاتا ہے، ہندوستانی مسلمانوں کی معاشرت اور رسوم کا دائرہ بہت وسیع ہے، مصنف کا مقصد صاف ستھرے دیندار گھرانوں کی اسلامی معاشرت کا نقشہ دکھانا ہے اس مقصد میں یہ کتاب پوری طرح کامیاب ہے اس سے اس کی پوری تصویر سامنے آجاتی ہے کہیں کہیں بعض غیر اسلامی رسوم بھی نقد و تبصرہ کے بغیر نقل کر دی ہیں، مصنف کی دوسری علمی تصانیف کے مقابلہ میں یہ کتاب اگرچہ ہلکی پھلکی ہے لیکن افادہ عام کے لحاظ سے انسے زیادہ مفید ہے اور علمی کتابوں کی محنت و کاوش کا بار ہلکا کرنے کیلئے اس قسم کی تصنیف مصنف کے لئے ضروری ہے،

"م"

جلد ۱۱۰　　　ماہ رجب المرجب ۱۳۹۲ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۷۲ء عیسوی　　　عدد ۲

مضامین

مقالات

ادبیات

افسوس ہے کہ ہماری علمی بزم کی ایک اہم یادگار ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے گذشتہ مہینے انتقال کیا، وہ اس دور کے مشہور فاضل اور نامور محقق تھے، اُن کا موضوع عربی لسانیات تھا، اس کے متعلقات علم الاشتقاق، رسم الخط حروف و اصوات وغیرہ پر اُن کی نظر بڑی دقیق تھی، اور اپنی تحریروں میں اس کا بڑا اہتمام رکھتے تھے، اُن کی پوری زندگی علمی و تعلیمی خدمات میں گذری، مگر لکھتے کم تھے، اس لئے غالباً متفرق مضامین کے علاوہ کوئی مستقل تصنیف یادگار نہیں چھوڑی، مگر اُن کے یہ مضامین اُن کی محققانہ نظر کا ثبوت ہیں، عرصہ ہوا الٰہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ عربی و فارسی کی صدارت سے ریٹائر ہوئے تھے، اور الٰہ آباد ہی میں سکونت اختیار کر لی تھی، ایک زمانہ میں ہندوستانی اکیڈمی الٰہ آباد کے رکن رکین تھے یونیورسٹیوں اور دوسری علمی مجالس میں ان کا بڑا وقار تھا، دار المصنفین کی مجلس انتظامیہ کے بھی رکن تھے، ان کا رہن سہن تو جدید تھا لیکن شرافت و وضعداری اور شفقت و محبت میں مشرقی تہذیب کا نمونہ تھے، ادھر کئی سال سے بالکل معذور ہو گئے تھے، آخر میں ہوش و حواس نے بھی جواب دیدیا تھا، اسی حالت میں گذشتہ جولائی میں انتقال کیا، انتقال کے وقت ۸۰ سال کی عمر تھی، مسلمانوں میں ایسے محقق اب مشکل سے پیدا ہوں گے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

.......o.✻.o.......

نسلی، لسانی اور جغرافی عصبیت نے مسلمانوں کو ہمیشہ نقصان پہنچایا ہے، مگر اس سے انھوں نے کوئی سبق نہیں لیا، ایک حد تک ان چیزوں کی بھی اہمیت ہے، لیکن اتنی نہیں کہ اس کے لئے وسیع ملی مفاد

کو قربان کر دیا جائے، بلکہ اپنے وجود کو بھی خطرہ میں ڈال دیا جائے، اس عصبیت نے دولتِ عثمانیہ کو ختم کیا، اور عرب دنیا کو چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں تقسیم کر کے ان کی قوت اتنی کمزور کر دی کہ وہ اپنا وجود قائم رکھنے میں دوسروں کی دست نگر ہیں، پھر جغرافی وطنیت نے ان میں بھی ایسا اختلاف پیدا کر دیا کہ وہ اب تک متحد نہ ہو سکیں، اور وہ اسرائیل جیسی چھوٹی اور نو مولود حکومت کا مقابلہ نہیں کر سکتیں اسی عصبیت نے پاکستان کے دو ٹکڑے کر دیئے، اور وحشت و بربریت کا ایسا برا نمونہ پیش کیا جس کی مثال اسلامی تاریخ میں نہیں ملتی، اور اب یہی عصبیت مغربی پاکستان میں بھی ابھر رہی ہے،

.......o.✻.o.......

کس قدر عبرت کا مقام ہے کہ جس مذہب نے ساری عصبیتوں کو مٹا کر ملتِ اسلامیہ کی بنیاد اسلامی وحدت و اخوت پر رکھی تھی، اور انصار نے اس کا یہ نمونہ پیش کیا تھا کہ اپنی املاک تک مہاجرین میں آدھی تقسیم کر دی تھی، آج اس مذہب کے ماننے والے محض زبان، نسل، اور جغرافی وطنیت کے اختلاف کی بنا پر ایک دوسرے کو برداشت نہیں کر سکتے، پاکستان کا ہر حصہ آزادی کا طالب ہے، مہاجرین پر جن کی قربانیوں کی بدولت پاکستان قائم ہوا، اور جنھوں نے اپنا سارا خانماں لٹا کر پاکستان میں پناہ لی تھی، اس کی سرزمین اتنی تنگ ہو رہی ہے کہ ان کے مقابلہ میں ہندوستان کے مسلمان مخالف حالات کے باوجود زیادہ امن و سکون سے ہیں، دوسرا ملک تو ہندوستان ہے، جہاں اخوت و وحدت کی کوئی تعلیم نہیں، بلکہ اُس کا پرانا نظام طبقاتی ہے، اور جہاں پاکستان سے کہیں زیادہ مذہبی، نسلی، لسانی، اور تہذیبی اختلافات ہیں، مگر ملک کی سالمیت اور وحدت پر سب متفق ہیں، اگر اس کے خلاف کوئی کمزور آواز اٹھتی ہے، تو وہ حقوق طلبی سے آگے نہیں بڑھتی، یہاں کے مقامی باشندوں اور شرنارتھیوں میں کوئی تفریق و مغائرت نہیں، یہ مسئلہ یہاں کب کا حل ہو چکا، شرنارتھی اپنے نئے وطن میں پورے اطمینان اور سکون کی زندگی

بسر کر رہے ہیں،

.......٭٭.......

مذہبی اخوت سے قطع نظر خالص ملکی مفاد کے نقطۂ نظر سے، یہ عصبیت پاکستان کے لئے انتہائی مہلک ہے، اگر سندھ اور بلوچستان جیسے چھوٹے صوبے جن کی آبادی ہندوستان کے بڑے ضلعوں کے برابر بھی نہیں ہے، آزاد ہو گئے تو اُن کی حیثیت پرانی دیسی ریاستوں سے زیادہ نہ ہوگی، وہ اپنا وجود کس طرح قائم رکھ سکیں گے، مشرقی بنگال کی مثال سامنے رکھنا صحیح نہیں ہے، وہ مذہب کے علاوہ ہر حیثیت سے مغربی پاکستان سے الگ اور اُس سے مختلف ہے، اگرچہ وہ مسلمان ملک ہے لیکن اس پر اسلامی تہذیب کا اثر اور دنیا کے مسلمانوں سے اسکے تعلق بہت کم رہا، اس لئے وہاں سے اسلامی وحدت کی مخالفت کوئی تعجب انگیز بات نہیں ہے لیکن سندھ وہ علاقہ ہے، جہاں اسلام کا پرچم سب سے پہلے لہرایا، اور سب سے پہلے اسلامی حکومت قائم ہوئی، اور شمالی ہند سے مدتوں پہلے وہ اسلامی علوم و فنون اور اسلامی تہذیب کا مرکز رہا، یہاں کے علمار نے دنیائے اسلام میں سندھ کا نام اونچا کیا، سندھی زبان میں عربی و فارسی الفاظ کی کثرت ہے، اس کا رسم الخط بھی فارسی ہے، سندھ اور ملتان میں جتنے اسلامی آثار ہیں، دلی اور لاہور کے علاوہ اور کسی شہر میں مشکل سے ملیں گے، ان خصوصیات کے ہوتے ہوئے وہاں سے جاہلی عصبیت کے نعروں کا بلند ہونا حیرت انگیز ہے، اگر یہ عصبیت قائم رہی تو مغربی پاکستان ... کو بھی لے ڈوبے گی، ان حالات کو دیکھ کر یہ کہنا پڑتا ہے، کہ ہندوستان کی تقسیم غلط تھی، اس سے ہندوستان کے مسلمان الگ برباد ہوئے، اور پاکستان کا تخیل بھی کامیاب نہ ہوا، ملت اسلامیہ کا جو حصہ بھی واعتصموا بحبل اللّٰہ کو چھوڑیگا اس کا انجام یہی ہوگا، بلکہ اُس کو یستبدل قوما غیرکم کے لئے بھی تیار رہنا چاہئے۔

.......٭٭.......

مقالات

تہذیب کی تشکیل جدید

معاشی نظام

(۵)

از مولانا محمد تقی امینی، ناظم شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مغربی تہذیب میکانکی نظریۂ حیات پر قائم ہے

مغربی تہذیب میکانکی نظریۂ حیات پر قائم ہے، جو انسان کی طبعی زندگی (Physical) اور اس کے ذاتی مفاد تک محدود ہے، اس بنا پر اس کے معاشی نظام میں صرف ان ضرورتوں کو زیر بحث لایا گیا ہے، جن کا تعلق انسان کی مادی ضرورتوں اور حیوانی تقاضوں سے ہے، اور جن میں عقل کی رہنمائی کافی سمجھی گئی ہے، ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے عقل نے پہلے نظام سرمایہ داری کو جنم دیا، جب اس میں کامیابی نہ ہو سکی تو سوشلزم اور کمیونزم کو ایجاد کیا، جن کا ابھی تجربہ ہو رہا ہے،

تشکیل جدید ربانی نظریۂ حیات پر قائم ہے

تشکیل جدید ... کی بنیاد ربانی نظریۂ حیات پر قائم ہے، جس نے زندگی کو دو حصوں مادی و غیر مادی میں تقسیم کیا، اور تکمیل انسانیت کیلئے دونوں کو لازم و ملزوم قرار دیا، اس بنا پر اس کے معاشی نظام میں دونوں کی ضرورتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے اور تنہا عقل کی رہنمائی کو ناکافی سمجھا گیا،

تکمیلِ انسانیت کے لئے زندگی کا اورائی عنصر کم اہم نہیں، بلکہ مقابلۃً زیادہ اہم ہے کیونکہ اصلاً یہی حصہ صفاتِ الٰہی کا مظہر اور اقدارِ حیات کا حامل ہوتا ہے، اگر اس کو نظرانداز کر دیا جائے تو انسان کی حیثیت گوشت پوست کے لوتھڑے سے زیادہ نہ رہے گی،

عقل ذاتی مفاد کی، اور وحی اقدارِ حیات کی حفاظت کرتی ہے،

صفاتِ الٰہی کے عکس سے زندگی میں جو صفات نمودار ہوتی ہیں ان کو "اقدارِ حیات" کہتے ہیں، ان میں تبدیلی اور زمان و مکان کی پابندی نہیں ہوتی، اُن کی ابتدا وہاں سے ہوتی ہے، جہاں عقل کی سرحد ختم ہوتی ہے اس بنا پر ان کی رہنمائی کے لئے ایک بلند و برتر شے کی ضرورت ہے، اور وہ وحی ہے، اس طرح تشکیل جدید میں ذاتی مفاد کی حفاظت عقل کے ذریعہ ہوتی، اور ان اقدار کی حفاظت وحی کے ذریعہ، ظاہر ہے کہ جو نظام ان دونوں کی حفاظت پر مبنی ہو، وہی انسانی فلاح و بہبود کا ضامن ہو سکتا ہے،

اقدارِ حیات کی حفاظت سے نہ صرف ہر شخص دوسرے کی دست برد سے محفوظ رہے گا، بلکہ دوسرے کے مفاد کو اپنا مفاد اور اس کے نقصان کو اپنا نقصان جانے گا، اور ضرورت کے وقت خود نقصان اٹھا کر دوسرے کے فائدہ کا سامان فراہم کرنے سے بھی دریغ نہ کرے گا، چنانچہ قرآن حکیم میں ہے:-

وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ[1]

وہ لوگ اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں، اگرچہ ان کو فاقہ ہی کیوں نہ ہو،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے،

[1] القرآن - حشر - ع - ۱،

لَا يُؤْمِنُ عَبْدٌ حَتّٰى يُحِبَّ لِاَخِيْهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهٖ[1]

بندہ پورا مومن اُس وقت تک نہیں ہوتا، جب تک کہ اپنے بھائی کے لئے وہی نہ پسند کرے، جو اپنی ذات کے لئے پسند کرتا ہے،

اقدار حیات کی حفاظت سے سرمایہ داری کی لعنت ختم ہو جائیگی جس کو کارل مارکس نے تاریخی وجوب سے ختم کرنا چاہا

"اقدار حیات" کی حفاظت سے سرمایہ داری کی لعنت ختم ہو جائے گی، اور معاشی استحصال سے نجات مل جائے گی، جس کے لئے کارل مارکس کو کوئی مضبوط بنیاد نہ مل سکی، اور مجبوراً اس کو تاریخی وجوب (Historical necessity) کا سہارا لینا پڑا، جیسا کہ Laurat L. نے لکھا ہے:-

"مارکس اور انجلز نے اپنی اشتراکی تمناؤں کا جواز اخلاقی بنیادوں پر نہیں رکھا، بلکہ یہ کہا کہ اشتراکیت تاریخی وجوب کا تقاضہ ہے، (یعنی تاریخ سے ثابت ہے کہ کوئی نظام ہمیشہ ایک حالت پر قائم نہیں رہتا، بلکہ کچھ دن کے بعد اندر سے ایک دوسرا نظام ابھرتا ہے جو بڑی حد تک اس کی ضد ہوتا ہے)[2]"

لیکن تاریخی وجوب کا سہارا اتنا مضبوط نہ تھا کہ وہ معاشی نظام کے لئے کوئی مستحکم بنیاد فراہم کرتا، یہی وجہ ہے کہ لینن اور پھر اس کے بعد اسٹالن نے اشتراکی تصورات میں کافی تبدیلی کر دی، جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے،

اقدار حیات کی حفاظت کے طریق کار میں حکومت کے اختیارات کافی وسیع ہیں

اقدار حیات کی حفاظت کا تعلق صرف وعظ و تبلیغ سے نہیں بلکہ حکومت کے قانون سے بھی ہے یعنی حکومت ذرائع پیداوار کی تنظیم اور پیداوار کی

[1] بخاری و مسلم و مشکوٰۃ باب الشفقۃ والرحمۃ علی الخلق الفصل الاول [2] Karl Marx Democracy

تقسیم اس طرح کرنے پر مامور ہے کہ ہر سطح پر ان کی حفاظت کا بندوبست ہوتا رہے، اس لئے تشکیل جدید میں صرف اصل مقصد پر زور دیا گیا ہے یعنی اللہ کی مخلوق کو رزق حلال میسر ہو، اور بدلے ہوئے حالات کے مطابق عدل و انصاف کے ساتھ اس کی حاجتیں پوری ہوتی رہیں، اس کی تنظیم و تقسیم کی تفصیلات سے بحث نہیں کی گئی ہے، ان میں حالات و زمانہ کے لحاظ سے تبدیلی ہوتی رہتی ہے، بلکہ امانت و نیابت کے دو بنیادی اصول بتا کر یہ واضح کیا گیا ہے کہ انفرادی و اجتماعی جو صورت بھی ہو، ہر چیز کا حقیقی مالک اللہ تعالیٰ ہے، انسان کو ساری چیزیں نائب ہونے کی حیثیت سے بطور امانت استعمال کے لئے دی گئی ہیں، اس سلسلہ کی چند آیتیں عمومی انداز کی یہ ہیں،

إن الله يأمركم أن تؤدوا الأمانات إلى أهلها[1] — بیشک اللہ تمھیں اس بات کا حکم دیتا ہے کہ امانتوں کو اُن کے اہل تک پہنچاؤ،

امانات سے تمام حقوق واجبہ اور فرائض مراد ہیں جس کی تفصیل پہلے گذر چکی،

دوسری جگہ ارشاد ہے،

وأنفقوا مما جعلكم مستخلفين فيه[2] — اور اس میں سے خرچ کرو جس میں اللہ نے تمھیں نائب بنایا ہے،

تنظیم و تقسیم سے متعلق سوالات کے مختلف جواب سے استدلال

تنظیم و تقسیم کے بعض احکام ذکر کرنے کے بعد ہے،

كي لا يكون دولة بين الأغنياء منكم[3] — تاکہ دولت تم میں مالداروں کے درمیان سمٹ کر رہ جائے،

صرف کے بارے میں ایک موقع پر سوال کا جواب یہ دیا گیا،

۱؎ نساء - ۲۰ - ۲؎ حدید - ۱ - ۳؎ حشر - ۶ -

قل العفو[1] — آپ کہہ دیجئے جو ضرورت سے فاضل ہو سب خرچ کرو،

دوسرے موقع پر یہ جواب ہے،

قل ما أنفقتم من خير فللوالدين والأقربين واليتامى والمساكين وابن السبيل[2] — آپ کہہ دیجئے جو بھی تم اپنے مال سے نکال سکتے ہو نکالو، اس کے مستحق تمھارے ماں باپ، عزیز و اقربا، یتیم، مسکین اور مسافر ہیں،

جواب کا یہ اختلاف معاشی ضرورت کے لحاظ سے تقسیم کے فرق کو ظاہر کرتا، اور "العفو" سے تو اس حد تک ثبوت ملتا ہے کہ حالات کے زیادہ دباؤ کے وقت ضرورت سے زائد میں صاحب مال کا کوئی حق نہیں ہے، کل خرچ کر دینا چاہئے،

ان آیتوں کے علاوہ بہت سی آیات میں خرچ کرنے کی تاکید ہے، اور اسکے مستحقین کی تفصیل بھی کر دی ہے، لیکن مقدار اور تقسیم کی نوعیت سے کوئی بحث نہیں ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس سلسلہ کے احکام حالات و زمانہ کی رعایت سے بدلتے رہتے ہیں، اور ان میں تبدیلی کی جا سکتی ہے،

حالات کے لحاظ سے عدل و توازن پیدا کرنے، اور برقرار رکھنے کے قوانین مختلف ہوں گے

جس طرح معاشی زندگی کے حالات ہر دور میں یکساں نہیں ہوتے، اسی طرح عدل و توازن پیدا کرنے اور برقرار رکھنے کے قوانین میں بھی یکسانیت قائم نہیں رہ سکتی، جب قوم طبقاتی کشمکش میں مبتلا ہو، سرمایہ ایک طبقہ میں سمٹ کر رہ گیا ہو، اور دوسرا طبقہ وسائل معاش سے محروم اور نان جویں کا محتاج ہو، تو ایسی حالت میں عدل و توازن پیدا کرنے کے قوانین اس وقت

۱؎ بقرہ - ۲۷ - ۲؎ بقرہ - ۲۶،

سے یقیناً مختلف ہوں گے جب قوم خوش حال ہو، اور معاشی عدم توازن کسی طبقہ کی محرومی کی حد تک نہ پہنچا ہو، ایسی صورت میں قرآن حکیم اگر تنظیم و تقسیم کا کوئی ایک طبقہ متعین کر دیتا، یا مروجہ انفرادی و اجتماعی ملکیت کو اصولی اور بنیادی قرار دیدیتا تو اس کی عالمگیریت کو نقصان پہنچتا، اور تکمیل ہدایت کا مقصد پورا نہ ہوتا،

مقصد عدل کا قیام ہے جس طرح بھی ہو	ابن قیمؒ کہتے ہیں :-

ان مقصوده اقامة العدل بين عباده وقيام الناس بالقسط فاى طريق استخرج بها العدل والقسط فهى من الدين ليست مخالفة له[1]

شریعت سے اللہ کا مقصود بندوں کے درمیان عدل و انصاف کا قیام ہے جس طریق کے ذریعہ عدل و انصاف قائم کیا جائے گا، وہی دین ہوگا، اس کو دین کے خلاف نہ کہا جائے گا،

ایک اور جگہ اس حقیقت کو دوسرے انداز میں بیان کیا ہے،

فان الشريعة مبناها واساسها على الحكم ومصالح العباد فى المعاش والمعاد وهى عدل كلها و مصالح كلها وحكمة كلها فكل مسئلة خرجت من العدل الى الجور وعن الرحمة الى ضدها وعن المصلحة الى المفسدة

شریعت کی بنیاد حکمتوں اور دنیاوی و اُخروی زندگی کی مصلحتوں پر ہے وہ تمام تر عدل و رحمت اور حکمت و مصلحت ہے، جو مسئلہ بھی عدل سے جور کی طرف، رحمت سے زحمت کی طرف مصلحت سے مفسدہ کی طرف اور حکمت

سلہ الطرق الحکمیہ ص ۱۴

وعن الحكمة الى العبث فليست من الشريعة وان ادخل فيها بالتاويل[1]

سے فعل عبث کی طرف لے جائے، وہ شریعت کا مسئلہ نہ ہوگا، اگرچہ اس کو تاویل کے ذریعہ شریعت میں داخل کر لیا جائے،

قانون میں اوسط درجہ کی طرز معیشت کا لحاظ رکھنا چاہیے	دنیوی مصالح کے تین درجے ہیں جن کے لحاظ سے عدل و توازن کے قوانین میں تفاوت ہو سکتا ہے،

(۱) ادنیٰ (۲) اوسط (۳) اعلیٰ،

ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ کھانے پینے لباس، مکان، نکاح، اور دیگر ضروریات زندگی میں اتنی سہولت حاصل ہو کہ کام چلتا رہے، اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ عمدہ غذا، بہترین لباس عالی شان مکان، خوبصورت عورتوں سے شادی کے سامان میسر ہوں،

اوسط درجہ ان دونوں کے درمیان ہے یعنی نہ اس قدر وسعت ہو کہ اعلیٰ تک پہنچ سکے، اور نہ اس قدر تنگی ہو کہ ادنیٰ کے درجہ میں رہجائے،

معاشی زندگی میں عدل و مساوات کا اعتبار اوسط درجہ میں کیا جائے گا، اور اسی اعتبار سے قوانین بنانے کا اختیار ہوگا، فقہاء نے اس درجہ کو حاجات سے تعبیر کیا ہے،

تقدير النفقات بالحاجات مع تفاوتها عدل وتسوية من جهة انه سوى بين المنفق عليهم فى دفع حاجاتهم

نفقات (اخراجات) میں عدل و مساوات کا اعتبار حاجات کے لحاظ سے ہوگا یعنی یہ ضروری ہے کہ اوسط درجہ کے معیار سے لوگوں کی ضرورتیں

۱؎ اعلام الموقعین جلد ۳ ۔ ص ۳۷ ۔

لا فی مقادیر ما وصل الیھم	پوری ہوں یہ ضروری نہیں ہے کہ
لان دفع الحاجات ھو	سب کو ایک مقدار میں دیا جائے،
المقصود الاعظم فی النفقات	کیونکہ اخراجات میں شریعت کا
وغیرھا من اموال المصالح[1]،	مقصود اعظم اوسط درجہ رحاجات)

کا لحاظ ہے،

وضع قوانین میں وسعت

اس اوسط درجہ کو حاصل کرنے کے لیے جس قسم کی تنظیم و تقسیم درکار ہوگی، اور جیسے قوانین وضع کرنے ہوں گے، وہ سب شرعی اور اسلامی ہوں گے، ان سب کا تعلق طریق کار سے ہے، اور یہ ضروری نہیں ہے کہ طریق کار کا ثبوت قرآن وسنت سے ہو، حالات کے لحاظ سے اس میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے، اس لئے کسی ایک طریقہ کار پر اکتفا نہیں کیا جاسکتا،

ابن قیم کہتے ہیں:۔

فاذا ظھرت امارات الحق	حق کی علامتیں اور دلیلیں جس طریقہ
وادلتہ بای طریق فثم	سے بھی ظاہر ہوں وہ سب شرع
من شرعۃ ودینہ ورضاہ	اور دین ہوگا، اور اسی میں اللہ
وامرہ[2]،	کی رضا اور اس کا حکم ہوگا،

حکومت کی معاشی ذمہ داری سے متعلق تفصیلات

ذیل میں حکومت کی معاشی ذمہ داری سے متعلق بعض تفصیلات ذکر کی جاتی ہیں، جن سے وضع قوانین میں اس کے اختیارات کی وسعت کا بھی ثبوت ملتا ہے،

حضرت عمرؓ نے حکومت وعوام کے درمیان معاشی تعلق کو ایک مثال کے ذریعہ اس

[1] قواعد الاحکام ج ۱ ص ۴۸، [2] اعلام الموقعین ج ۳ ص ۳۷۵،

طرح سمجھایا ہے،

انما مثلنا کمثل قوم سافروا	ہماری (خلافت) مثال، اور قوم کی
فدفعوا نفقاتھم الی رجل	مثال ایسی ہے جیسے کچھ لوگوں نے سفر
منھم فقالوا لہ انفق علینا	کیا، اور اپنے اخراجات کی رقم اپنے
فھل لہ ان یستاثر علیھم	میں سے کسی شخص کو یہ کہکر حوالہ کردی
بشیء قال لا[1]،	کہ ہمارے اوپر خرچ کرتے رہو، کیا
	ایسی صورت میں ان کے ساتھ کسی
	قسم کا ترجیحی سلوک روا ہو سکتا ہے؟
	فرمایا، ہرگز نہیں،

فتح قادسیہ کی خوشخبری سناتے وقت حضرت عمرؓ نے خلافت کی ذمہ داری یہ بیان کی تھی:۔

"جب تک لوگوں میں اس قدر وسعت ہے کہ ان کے مال کے ذریعہ ایک دوسرے کی ضرورتیں پوری ہو سکتی ہیں، میں تمہاری ضروریات پوری کرتا رہوں گا، اور جب یہ وسعت نہ ہوگی تو ہم زندگی میں تنگی کریں گے، یہاں تک کہ کفاف (بقدر ضرورت) میں ہم سب برابر ہو جائیں، کاش ہم جان سکتے کہ مجھے تمہارا کس قدر خیال ہے؟ اس کو میں اپنے عمل کے ذریعہ ہی سمجھا سکتا ہوں، خدا کی قسم میں بادشاہ نہیں ہوں کہ تمہیں غلام بناؤں، بلکہ خود اللہ کا غلام ہوں، اور حکمرانی کی امانت میرے سپرد ہے" اگر میں اس کو امانت سمجھ کر تمہیں واپس کردوں اور خدمت کے لئے تمہارے پیچھے

[1] ابن جوزی تاریخ عمر الباب التاسع والثلاثون،

پیچھے پیچھے چلوں یہاں تک کہ تم اپنے گھروں میں سیر ہو کر کھا دیو، تو اس حکمرانی کے ذریعہ فلاح پاؤں گا، اور اگر اس کو ذاتی ملکیت سمجھوں اور (مطالبہ حقوق) کے لئے اپنے پیچھے چلنے اور گھر آنے پر مجبور کروں تو میرا انجام خراب ہو جائے گا،[1]

حضرت ابو موسیٰ اشعری (گورنر بصرہ) کو یہ ہدایت کی،

الا أوسعوا الناس فی بیوتھم	غور سے سن لو، لوگوں کے گھروں
واطعموا عیالھم[2]	میں ان کی فراخی کا سامان کرو، اور
	ان کے اہل وعیال کو کھانا کھلاؤ،

حضرت عمر بن عبدالعزیز جب خلیفہ ہوئے تو ذمہ داری محسوس کر کے رونے لگے، یہاں تک کہ آنسوؤں سے ان کی داڑھی تر ہو گئی، اُن کی بیوی فاطمہؓ نے رونے کا سبب پوچھا، کہ

احدث شیٔ	کیا کوئی نئی بات پیش آگئی،

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے جواب میں فرمایا،

"میں نے پوری امت کی ذمہ داری لی ہے، اس میں ہر قسم کے لوگ ہیں، بھوکے فقیر بے سہارا، مریض، بے سروسامان مجاہد، بے بس، مظلوم، غریب، قیدی، بہت بوڑھے کثیر العیال، جن کے پاس مال کم ہے، اسی طرح مختلف علاقوں کے رہنے والے دوسرے ضرورت مند ہیں، قیامت کے دن ان سب کے بارے میں مجھ سے باز پرس ہوگی، اور ان کے مقدمہ کی پیروی کرنے والے اللہ کے رسول ہوں گے، مجھے اندیشہ ہے کہ میں جرح میں ٹوٹ جاؤں گا، اسی لئے اپنی جان پر ترس کھا کر رو رہا ہوں"[3]

---

[1] البدایة والنھایه ج ۷، ص ۴۶، [2] سراج الملوک ص ۱۰۹ طرطوسی،

[3] تاریخ الکامل ج ۵ ص ۲۳ و کتاب الخراج لابی یوسف ص ۱۰،

حکومت دو قسم کے انتظام کی ذمہ دار ہے

تشکیل جدید میں حکومت دو قسم کے معاشی انتظام کی ذمہ دار ہے،

(الف) وہ جن سے (درجہ اوسط میں) قوم کی ضرورتیں پوری ہوں،

(ب) جس کے ذریعہ معاشی لحاظ سے قوم خود کفیل ہے،

وہ جن سے قوم کی ضرورتیں پوری ہوں

(الف) ضرورتوں میں بنیادی وغیر بنیادی سب شامل ہیں، مثلاً غذا، لباس، مکان، علاج، تعلیم، اہل وعیال کی کفالت، قرض کی ادائگی، شادی اور وقت ضرورت، خادم وغیرہ، اصولی حیثیت سے بنیادی ضرورتوں کے بارہ میں حکومت کی ذمہ داریوں کا تذکرہ مختلف روایات میں ہے،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ حمیر کو مخاطب کرتے ہوئے ایک خط میں لکھا،

انی امرکم یا حمیر خیراً فلا	اے حمیر! میں تمھیں بھلائی کا حکم
تخونوا ولا تحادوا ان رسول	دیتا ہوں، خیانت نہ کرو، آپس
اللہ مولی غنیکم وفقیرکم،[1]	میں مخالفت نہ کرو۔ بیشک اللہ
	کا رسول (بحیثیت سربراہ حکومت)
	مالدار اور فقیر سب کا سرپرست ہے،

دوسری جگہ ہے:۔

السُّلطانُ ولیُّ مَن لا ولیَّ لہٗ،[2]	حکمراں اس کا سرپرست ہے جس کا کوئی سرپرست نہیں،

---

[1] کتاب الاموال لابی عبید ۲۱ [2] ترمذی ابواب الفرائض باب ما جاء فی میراث المال

ایک اور جگہ ہے،

اللہ ورسولہ مولی من لا مولی لہ[1]	اللہ اور رسول (حکومت) اس کے سرپرست ہیں، جس کا کوئی سرپرست نہیں،

اسی طرح ایک اور موقع پر حضرت عمرؓ نے اپنے خطبہ میں فرمایا،

ایھا الناس ان اللہ قد کلفنی ان اصرف عنہ الدعاء[2]	اے لوگو! اللہ نے مجھے اس بات کا مکلف کیا ہے، کہ اس سے کی جانے والی دعا کو دور کردوں،

عزیز الدین عبد العزیز (مشہور شافعی فقیہ) کہتے ہیں:۔

"دعا دور کرنے کا مطلب یہ ہے کہ حکومت مظلوموں کے ساتھ انصاف کرے، اللہ سے اُن کو انصاف طلب کرنے کی حاجت نہ رہے، اور لوگوں کی ضرورتیں پوری کرے، اللہ سے مانگنے کی نوبت نہ آنے دے،"[3]

پھر اس کے بعد ہے:۔

ثما افصح ھذہ الکلمۃ و ما اجمعھا لمعظم حقوق المسلمین[4]	حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ کس قدر فصیح اور حقوق کے کس قدر جامع ہیں، ؟

غذا لباس اور مکان

اصولی اور عمومی حیثیت کے علاوہ حدیثوں میں بنیادی ضرورتوں کی

[1] ابوداود کتاب النکاح باب العضل، [2] و [3] و [4] قواعد الاحکام مصالح الانام ج ۱ ص ۱۴۷،

تصریح بھی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے،

لیس لابن آدم حق فی سوی ھذہ الخصال بیت یسکنہ وثوب یواری بہ عورتہ وجلف الخبز والماء[1]	تین چیزوں کے علاوہ اور کسی میں انسان کا کوئی حق نہیں، (۱) رہنے کے لئے گھر، (۲) تن ڈھکنے کے لئے کپڑا اور (۳) پانی اور روٹی کا ٹکڑا،

ابن قیم کہتے ہیں:۔

وحاجۃ المسلمین الی الطعام واللباس وغیر ذالک مصلحۃ عامۃ لیس الحق فیھا لواحد بعینہ[2]	غذا، لباس وغیرہ کا تعلق مصالح عامہ سے ہے، جن میں کسی کا خاص حق نہیں ہے، بلکہ سب ان میں شریک ہیں،

علاج تعلیم

علاج و تعلیم کا ذکر حضرت عمرؓ نے فرمایا،

لو ترکت عنز جرباء الی جانب ساقیۃ لم تدھن لخشیت ان اسأل علیھا یوم القیٰمۃ[3]	اگر نہر کے کنارے خارشتی بکری اس حال میں چھوڑ دی جائے کہ اس پر (بطور علاج) تیل کی مالش نہ ہو تو ڈر ہے کہ قیامت کے دن عمر سے اس کی بازپرس ہوگی،

انسان کا معاملہ جانور سے زیادہ اہم اور اس کے بارہ میں بازپرس کا زیادہ اندیشہ ہے،

[1] ترمذی، [2] الطرق الحکمیہ ص ۲۶۲، ابن قیم رح، [3] التبر المسبوک صفحہ ۱۷ غزالی،

جو حکومت جانور کے علاج میں ذمہ داری محسوس کرتی ہے، وہ انسانوں کے علاج میں کس قدر ذمہ دار ہوگی؟

تعلیم کے سلسلہ میں مختلف انتظامات کا ثبوت ملتا ہے، جن کو موجودہ دور کے مطابق وسیع کیا جا سکتا ہے،

حدیثوں میں تحصیلِ علم کی بڑی فضیلت آئی ہے، اور اس کو ہر مسلمان کا فریضہ قرار دیا ہے، "طَلَبُ العلم فریضۃ علی کل مسلم ومسلمۃ"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سعیدؓ بن العاص کو لکھنا سکھانے کے لئے مقرر کیا[1] زیدؓ بن ثابت کو یہودیوں سے سریانی زبان سیکھنے کا حکم دیا،[2] دیہاتی علاقوں میں تعلیم کے لئے مختلف صحابہ کو بھیجا[3]، ڈاکٹر حمید اللہ نے عہدِ رسالت کے تعلیمی نظام پر پوری کتاب لکھی،

حضرت عمرؓ نے تعلیم کی اشاعت کے بڑے وسیع ذرائع اختیار کئے، مدرسہ قائم کرکے تنخواہ دار معلم مقرر کئے، تفصیل کا یہ موقع نہیں، مولانا شبلی نے اس کی پوری تفصیل لکھی ہے[4] حضرت عمر بن عبد العزیز نے اپنے زمانہ میں دیہاتی علاقوں میں معلم مقرر کئے وغیرہ[5]

تحصیل علم کے لئے وظیفہ (اسکالرشپ) جاری کرنے کا بھی ثبوت ملتا ہے، جیسا کہ ابو عبید نے کتاب الاموال میں الفرض علی تعلم القرآن والعلم (قرآن اور علم حاصل کرنے پر وظیفہ مقرر کرنا) کے تحت کئی روایتیں نقل کی ہیں،[6] علماء نے علم و تعلیم کی اہمیت اور اس کے نظام پر مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں ابن عبد البر اندلسی کی مختصر جامع بیان العلم والعلماء، اور شیخ بدر الدین کی تذکرۃ السامع والمتکلم قابلِ ذکر ہیں، اسلامی حکومتوں اور علماء نے تعلیم کی اشاعت اور علوم و فنون کی جس قدر خدمت کی ہے، اس پر تاریخ شاہد ہے،

---

[1] الاستیعاب فی معرفۃ الصحابہ ج ۱ ص ۲۹۳ [2] ابوداؤد کتاب العلم باب روایۃ اہل الکتاب [3] بخاری کتاب الاحکام [4] کنز العمال ج ۳ بحوالہ مسند ابن ابی شیبہ [5] ایضاً ص ۲۱۷، [6] کتاب الاموال لابی عبید ص ۲۶۱

اہل و عیال کی کفالت و قرض کی ادائگی

اہل و عیال کی کفالت اور قرض کی ادائگی کا ذکر ان روایتوں میں ہے، مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

من ترک مالاً فلاھلہ ومن ترک ضیاعاً فالیّ[1]

جس شخص نے مال چھوڑا، وہ اس کے گھر والوں کے لئے اور جس کو بے سہارا چھوڑا، اس کی کفالت میرے (رسول اللہ بحیثیت سربراہ حکومت) ذمہ ہے،

ترمذی میں ترک ضیاعاً کے یہ معنی بیان کئے گئے ہیں،

ضائعاً لیس لہ شیءٌ[2]

ضائع وہ ہے جس کے پاس کچھ نہ ہو،

اور الیّ کے معنی یہ ہیں، کہ

انا اعولہ وانفق علیہ[3]

میں اس کی کفالت کروں گا، اور اس پر خرچ کروں گا،

دوسری روایت ہے،

من ترک کلاً فالی اللہ ورسولہ وربما قال فالی اللہ ورسولہ[4]

جس شخص نے بوجھ (ذمہ داری) چھوڑا وہ اللہ کے ذمہ ہے، بسا اوقات فرمایا کہ اللہ و رسول کے ذمہ ہے،

ابو عبید نے "کل" کے یہ معنی بیان کئے ہیں،

الکل عندنا کل عیل والذریۃ

"کل" میں اولاد اور وہ سب لوگ

---

[1] کتاب الاموال لابی عبید ص ۲۶۱ [2] و [3] ترمذی ابواب الفرائض، [4] کتاب الاموال لابی عبید الفرض للذریۃ من الفجاء

منہم[1] (کتاب الاموال ص ۲۳۷) — شامل ہیں جن کی کفالت متوفی کے
لابی عبید الفرض للذریۃ من الغنی — ذمہ ہے،

ایک اور روایت میں ہے،

انا اولی بالمومنین من انفسہم — مومنوں سے میرا تعلق اُن کی اپنی
لمن توفی من المومنین — جانوں سے بھی زیادہ ہے، جس نے
فترک دینا فعلی قضاءہ و — وفات کے بعد قرض چھوڑا، اُس کی
من ترک مالا فلورثتہ[1] — ادائگی میرے ذمہ ہے، اور جس نے
مال چھوڑا وہ اس کے ورثہ کے لئے ہے،

ایک روایت میں قال اللہ و رسولہ (اس کی ادائگی اللہ اور رسول یعنی حکومت کے ذمہ ہے) کے الفاظ ہیں[2]

حضرت عمرؓ نے معاشی کفالت کے اعلان میں قرض کی ادائگی کو شامل کیا تھا،

ولا مدیونا الا قضی عنہ دینہ[3] — ہر مدیون کا دین ادا کیا جائے،

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے قرض کی ادائگی کے لئے جو فرمان جاری کیا تھا، اس کے الفاظ یہ ہیں،

انظر کل من ادان فی غیر سفہ — دیکھو ہر اس ادھار خریدنے والے
ولا سرف فاقض عنہ[4] — کا قرض ادا کرو، جو صاحب استطاعت
اور فضول خرچ نہ ہو،

(باقی)

---

[1] بخاری کتاب النفقات باب قول النبی من ترک[2] کتاب الاموال لابی عبید ص ۲۳۰، [3] شرح نمبر[4] الاسلام شید علی مادہ [5] کتاب الاموال،

حافظ امان اللہ بنارسیؒ

از
مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری اڈیٹر البلاغ بمبئی

گذشتہ دور میں جونپور، ظفر آباد، لکھنؤ اور الہ آباد کی طرح بنارس بھی دیار پورب میں اسلامی علوم و فنون اور ارباب فضل و کمال کا مرکز رہا ہے، اور یہاں کے علماء و مشایخ نے ہر زمانہ میں مدرسوں اور خانقاہوں کو اپنی علمی اور روحانی سرگرمیوں سے آباد رکھا، شیخ داؤد بن قطب بنارسی ۹۰۶ھ، شیخ مبارک بن ازرانی بنارسی ۹۸۰ھ، شیخ محمد ماہ بنارسی، شیخ طیب بن معین بنارسی ۱۰۴۲ھ، شیخ لیسین بن احمد بنارسی، شیخ نظام الدین بنارسی، حافظ امان اللہ بن مفتی نور اللہ بنارسی ۱۱۳۳ھ، مولانا محمد وارث رسول نما بنارسی ۱۱۶۶ھ، مولانا ابو البرکات بن فضل امام بنارسی ۱۲۸۹ھ، مفتی ابراہیم ابن عمر بنارسی ۱۲۵۴ھ، مفتی سخاوت علی بن مفتی ابراہیم بنارسی ۱۲۸۱ھ، مفتی واحد علی بن مفتی ابراہیم بنارسی ۱۲۷۹ھ، شیخ عمر بن غوث بنارسی ۱۲۲۵ھ، مولانا خالق علی بنارسی، مولوی جلال الدین احمد بنارسی ۱۲۷۹ھ وغیرہ اپنے اپنے دور میں یہاں کے مشائخ کبار

اور علمائے فحول میں گذرے ہیں، ان میں جامع المعقول والمنقول صاحبِ تصانیف کثیرہ حضرت مولانا حافظ امان اللہ بن مفتی نور اللہ حنفی بنارسی اپنے معاصرین میں خاص شہرت اور مخصوص مقام ومرتبہ کے مالک ہیں، آپکی بزمِ شرق میں ان ہی کا ذکر سرنامۂ داستان ہے،

ہماری تحقیق میں ان کے سب سے قدیم تذکرہ نگار شیخ غلام علی آزاد بلگرامی ۱۲۰۰ھ ہیں، جنھوں نے ان کی وفات کے سینتالیس برس بعد مآثر الکرام ۱۱۸۰ھ میں ان کا تذکرہ کیا اور سبحۃ المرجان میں بھی ان کا ذکر کیا ہے، ان دونوں کتابوں میں جو کچھ درج ہے وہی بعد کے سوانح نگاروں کا ماخذ ہے، چنانچہ تذکرہ علمائے ہند اور نزہتہ الخواطر وغیرہ میں ان ہی کتابوں کے حوالے سے ان کے حالات درج کئے گئے ہیں، اگر شاذ ونادر کوئی نئی بات دوسری کتابوں میں ملتی ہے تو ان کے معاصرین کے حالات کے ضمن میں ملتی ہے،

نام ونسب اور خاندانی حالات حافظ امان اللہ بن مفتی نور اللہ بن حسین بنارسی کا سلسلہ نسب اس سے زیادہ نہ مل سکا، ان کا خاندان کہاں سے اور کب بنارس میں آکر آباد ہوا؟ اس بارے میں بھی ان کے تذکرہ نویس خاموش ہیں، البتہ انکے والد مفتی نور اللہ ابن حسین عہد عالمگیری میں بنارس کے قاضی ومفتی اور صوفی صافی بزرگ ہونے کے ساتھ فقہائے احناف میں شمار ہوتے تھے، سلطان عالمگیرؒ ان کے بڑے معتقد تھے اور ان کے لئے مسجد اور خانقاہ تعمیر کرائی تھی، گنج ارشدی میں ہے کہ مفتی نور اللہ نے طریقت کی تعلیم وتربیت حضرت شیخ دیوان محمد رشید جونپوری ۱۰۷۰ھ سے حاصل کرکے ان کے فرزند حضرت شیخ محمد ارشد جونپوری ۱۱۱۳ھ سے خرقۂ خلافت وخلعت

پایا تھا، ان کا شمار مشاہیر فقہائے حنفیہ میں سے تھا، اور وہ اپنے زمانہ کے مشہور مشائخ چشت میں تھے، ۱۱۰۱ھ میں بنارس میں وفات پائی[1]، سلطان عالمگیر نے مفتی صاحب کے لئے محلہ دارانگر تیرتھ تالاب کے پاس ۱۰۷۰ھ میں ایک شاندار سنگین مسجد تعمیر کرائی تھی جو مسجد عالمگیری اور مسجد فوارہ کے نام سے آج بھی موجود ہے، اس کی تعمیر مفتی صاحب کے مشورہ سے ہوئی تھی، محراب میں آیت "فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ" کندہ ہے جس سے تاریخ تعمیر نکلتی ہے، اس کی تعمیر کے تقریباً بیس سال بعد ۱۰۹۶ھ میں عالمگیر کے حکم سے مفتی صاحب کے لئے ایک عالیشان خانقاہ بھی تعمیر ہوئی اس کا مادۂ تاریخ "دولت خانہ" ہے جس سے ۱۰۹۶ھ نکلتا ہے، خیال ہے کہ یہی خانقاہ دار القضاء بھی رہی ہوگی، اس کی دیوار پر ابتک یہ کتبہ موجود ہے،

زحکم شاہ سلطانِ شریعت — دلیل زہد، برہانِ طریقت
شہاب آسمانِ سرفرازی — محمد شاہ عالمگیر غازی
باستصواب نور اللہ مفتی — غلام درگہ پیرانِ چشتی
بنائے خانقاہے ہست پیدا — ز "دولت خانہ" تاریخش ہویدا

اس وقت مفتی صاحب کے فرزند حافظ امان اللہ سن رشد کو پہونچ چکے تھے، اور انھوں نے ۱۰۹۶ھ ہی میں خانقاہ کی تعمیر کے وقت والد کی حیات میں ان کے لئے مقبرہ اور روضہ تیار کرایا تھا جس میں مفتی صاحب اور ان کے بعد خود حافظ صاحب بھی دفن کئے گئے[2]،

حافظ صاحب کا مولد ومنشا بنارس ہے، مگر کب پیدا ہوئے؟ اس کے بارے میں کوئی تصریح نہیں ملتی، اتنا معلوم ہے کہ انھوں نے ۱۰۹۶ھ میں خانقاہ کی تعمیر کے وقت اپنے والد

---

[1] نزہتہ الخواطر ج ۶ صفحہ ۲۹۲، [2] تاریخ آثار بنارس صفحہ ۱۱۵، ۱۱۶

کا روضہ تعمیر کرایا تھا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت انکی عمر تیس چالیس سے کم نہ رہی ہوگی، اس حساب سے انکی پیدائش

تعلیم و تربیت حافظ صاحب نے ایسے گہوارے میں آنکھ کھولی جو علم و فضل کا مرکز تھا، آپ کے والد صوفی صافی ہونے کے ساتھ عالم فقیہ، مفتی اور قاضی بھی تھے، سلطان عالمگیر کی قدر شناسی اور علم پروری نے اس گھر میں جاہ و جلال بھی پیدا کر دیا تھا، اس زمانہ میں پورب کا علاقہ عالمگیر کی توجہ سے خانقاہ اور مدرسہ بنا ہوا تھا، شہر شہر، قریہ قریہ میں علماء و فضلاء سکون قلب کے ساتھ اپنے کاموں میں مشغول تھے، خصوصاً جونپور اور اس کے اطراف مدارس کا بہت بڑا مرکز تھے معلوم ہوتا تھا کہ سلطان ابراہیم شاہ شرقی کا دور لوٹ آیا ہے، مولوی خیر الدین محمد جونپوری نے تذکرۃ العلماء میں شیخ محمد ماہ کے ذکر میں لکھا ہے،

اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ خود عالم باعمل اور عامل باعلم بود، قدردانی علماء بیش از بیش می نمود و از عہد شاہ زادگی منظور داخت، تا جونپور مثل زمان سلاطین شرقیہ از کثرت فضلاء و مشائخان و انبوہ و ہجوم طلبۂ علوم و کاسبان فیوض رونق پذیر باشد، چون بر سریر سلطنت نشست بر تبلیغ واجب و تبلیغ بناظم جونپور جہت ترقیم احوال مدرسان و مشائخان

حضرت اورنگ زیب عالمگیر عالم باعمل اور عامل باعلم تھے، شاہزادگی ہی کے زمانہ سے علماء کی زیادہ سے زیادہ قدردانی کرتے تھے یہاں تک کہ اسی زمانہ میں جونپور سلاطین شرقیہ کے دور کے مانند ہوگیا اور علماء و مشائخ کی کثرت اور طالبان علوم و فیوض کے انبوہ سے رونق پیدا ہوگئی اور جب ۱۰۶۸ھ میں تخت سلطنت پر رونق افروز ہوئے تو ناظم جونپور کے نام خصوصی حکم

این شہر صادر گردانید و سوانح نگاران و وقائع نویسان را احکام تہدید بلیغ تحقیقات کو ائف بود و باش این گروہ فرستاد، القصہ جونپور در عہد آنحضرت نمونہ گلزار ارم شدہ، در تمام شہر و قصبات و نواحی آن مدرسہائے قدیم تاسیس یافتند و بے خانقاہ و مدرسہ تعمیر جدید شدند، [1]

جاری کیا تاکہ وہ یہاں کے اساتذہ و مشائخ کے حالات لکھ کر روانہ کرے نیز وقائع نویسوں کو سخت تاکید کی تاکہ وہ اس طبقہ کی معاش و معیشت کی خبر گیری کریں، الغرض عہد عالمگیری میں جونپور گلزار ارم بن گیا اور اس کے اطراف و جوانب کے شہر و قصبات میں قدیم مدارس کی ترقی کے ساتھ نئے مدارس اور خانقاہیں تعمیر ہوئیں،

علم دین اور روحانیت کے اس دور شباب میں حافظ صاحب پروان چڑھے، خود اُن کا گھر اس کا نمونہ تھا،

حافظ صاحب نے کس کس سے کہاں کہاں تعلیم حاصل کی؟ اس کے بارے میں بھی تفصیل نہیں ملتی ہے، آزاد نے سبحۃ المرجان میں اجمالی طور سے یہ لکھا ہے،

والحافظ امان اللہ حفظ القرآن واخذ العلوم من علماء الزمان [2]

حافظ امان اللہ نے قرآن حفظ کیا، اور اپنے زمانہ کے علماء سے علوم حاصل کئے،

نزہۃ الخواطر میں اس اجمال کی کسی قدر تفصیل ملتی ہے

وحفظ القرآن وسافر للعلم فقرأ الکتب الدراسیۃ

انھوں نے حفظ قرآن کے بعد طلب علم کے لئے سفر کیا اور شیخ محمد ماہ دیوگامی اور

---

[1] تذکرۃ العلماء ص ۱۰۱ الطافی پریس کلکتہ، [2] سبحۃ المرجان ص ۷۸

علی الشیخ محمد ماہ الدیوگامی وعلی الشیخ قطب الدین الحسینی الشمس آبادی وعلی غیرھما من العلماء، [1]

شیخ قطب الدین شمس آبادی وغیرہ سے کتب درسیہ پڑھیں،

ان بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ حافظ صاحب نے اپنے زمانہ کے کئی علماء سے پڑھا جن میں مذکورہ بالا دو حضرات خاص طور سے قابل ذکر ہیں اور تحصیل علم کے لئے بنارس سے باہر کا سفر کیا، ان کے علمی سفر کے سلسلے میں دو مقامات اہم ہیں، ایک جونپور جہاں ملا محمد ماہ دیوگامی نے پچیس[25] سال تک درس دیا تھا، تجلی نور میں ہے

اگرچہ او باشندہ قصبہ دیوگام ضلع اعظم گڈھ بود، الا بعد فراغ تابست و پنج سال در جونپور قیام ورزیدہ درس داد [2]

ملا محمد ماہ اگرچہ دیوگام ضلع اعظم گڈھ کے باشندے تھے مگر انھوں نے فراغت کے بعد پچیس سال تک جونپور میں قیام کر کے درس دیا،

قاضی صاحب کے سفر کی دوسری منزل شمس آباد ہے جہاں سید قطب الدین نے بود و باش اختیار کر لی تھی، مآثر الکرام میں ہے،

اصلش از سادات امیٹھی من مضافات اودھ است، از وطن خود نقل کردہ شمس آباد را مشرق انوار ساخت شمس آباد از توابع قنوج است [3]

دراصل وہ مضافات اودھ امیٹھی کے سادات سے ہیں مگر اپنے وطن سے نقل مکانی کر کے شمس آباد میں سکونت اختیار کر لی تھی جو کہ قنوج کے توابع میں ہے،

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۳، [2] تجلی نور ج ۲ ص ۶۳، [3] مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۱۰،

حافظ صاحب کو اپنے والد ماجد کے سایۂ عاطفت میں نشو ونما کا موقع ملا تھا، اور غالباً حفظ قرآن کے بعد ابتدائی کتابیں ان ہی سے پڑھیں پھر بنارس سے جونپور میں آکر ملا محمد ماہ دیوگامی کے مدرسہ میں داخل ہوئے اور وہاں سے شمس آباد جاکر شیخ قطب الدین سے بقیہ کتابیں پڑھیں، آزاد کے اس بیان "من علماء الزمان" اور نزہۃ الخواطر کی عبارت "وعلی غیرھما من العلماء" سے پتہ چلتا ہے کہ حافظ صاحب نے دوسرے اساتذہ سے بھی تحصیل علم کی تھی مگر ان کے ناموں کا پتہ نہیں چلتا،

ملا محمد ماہ دیوگامی

ملا محمد ماہ دیوگامی حافظ صاحب کے والد مفتی نور اللہ کے استاد بھائی تھے، دونوں نے شیخ محمد رشید جونپوری سے اکتساب فیض کیا تھا، تجلی نور میں ہے کہ

ملا محمد ماہ اپنے دیار کے ... مشہور علماء میں تھے، ان کی جامعیت کا یہ حال تھا کہ ملا رکن الدین بحریابادی سے تحصیل علم کے بعد مزید تکمیل و تحقیق ملا نور الدین مداری سے کی اس کے بعد دیوان محمد رشید سے فیض اٹھایا، وہ اپنے دور کے عالم اکمل اور فاضل اجل تھے اور پچیس سال تک جونپور میں درس و تدریس کی خدمت انجام دی اور سیکڑوں علماء و فضلاء ان کی درسگاہ سے پیدا ہوئے، ملا عبد الرسول سترکھی، حافظ امان اللہ بنارسی، اور مفتی ابو البقاء جونپوری ان کے خاص شاگردوں میں تھے، آخر عمر میں سلس البول کی بیماری میں مبتلا ہوگئے تھے، اسی میں انتقال کیا اور ایک قول کے مطابق بیاسی[2] سال کی عمر میں ۲۵ ر جمادی الاخریٰ ۱۰۹۵ھ میں وفات پائی، انکا مزار دیوگام (اعظم گڈھ اور بنارس کے درمیان) میں آج بھی موجود ہے، [1]

ملا قطب الدین شمس آبادی

انکا اصل وطن امیٹھی تھا، ملا قطب الدین سہالوی شہید

---

[1] تجلی نور ج ۲ ص ۶۳،

۱۱۰۳ھ کی درسگاہ کے فیض یافتہ تھے اور یہیں فاتحہ الفراغ پڑھی تھی۔ ملا قطب الدین سہالوی اپنے شاگرد قطب الدین شمس آبادی کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ "کسے کہ خواہد مغز سخن رادریابد، سید قطب الدین را او رایک نماید"، فراغت کے بعد شمس آباد میں مسند تدریس بچھائی، آپ کے تلامذہ کی تعداد بہت زیادہ ہے جن میں قاضی محب اللہ بہاری، حافظ امان اللہ بنارسی اور سید طفیل محمد اترولوی خاص شہرت کے مالک ہیں، تقریباً ستر سال کی عمر میں ۱۱۲۱ھ میں فوت ہوئے[۱]،

علمی تبحر حافظ صاحب نے حفظ قرآن کے بعد مروجہ علوم وفنون بنارس، جونپور، اور شمس آباد وغیرہ کے مشہور اساتذہ سے حاصل کئے، طریقت ان کے گھر کی دولت تھی اور ورثہ میں ملی تھی مگر اس راہ میں آخر عمر میں اس وقت آئے جب افتاد زمانہ سے پریشان ہو کر دہلی گئے، واپسی میں شیخ خوب اللہ الہ آبادی ۱۱۴۴ھ سے سلسلہ نقشبندیہ میں بیعت کی اس کی تفصیل بعد میں آئے گی۔ ان کے سوانح نگاروں نے ان کے علمی تبحر کا تذکرہ شاندار الفاظ میں کیا ہے، آزاد سبحۃ المرجان میں لکھتے ہیں،

وبرع في المعقول والمنقول وتبحر في الفروع والاصول[۲]

وہ معقولات ومنقولات میں بہت آگے اور اصول وفروع میں متبحر عالم تھے،

مآثر الکرام میں لکھا ہے،

از حفاظ قرآن واز فحول علمائے ہندوستان است ودر معقول ومنقول کوس شہرت می نواخت ودر علم فقہ علم امتیاز می افراخت[۳]

وہ حافظ قرآن ہونے کے ساتھ ہندوستان کے جید علماء میں سے ہیں، معقولات ومنقولات میں انکی شہرت کا ڈنکا بجتا تھا اور فقہ میں ممتاز تھے۔

۱ مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۲۰، ۲ سبحۃ المرجان ص ۸۷، ۳ مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۱۲،

تذکرہ علمائے ہند میں ہے،

حافظ قرآن جامع معقول ومنقول حاوی فروع واصول[۱]

حافظ قرآن جامع معقول ومنقول حاوی فروع واصول،

اور نزہۃ الخواطر میں ہے

الشیخ العالم الکبیر العلامۃ احد العلماء المشہورین في الفقہ والاصول والکلام[۲]

شیخ عالم کبیر علامہ اور فقہ اصول فقہ اور علم کلام کے مشہور علماء میں سے ایک ممتاز عالم تھے،

فقہ اور اصول فقہ کا فن حافظ صاحب کو ورثہ میں ملا تھا، ان کے والد مفتی نور اللہ اپنے زمانہ کے مشہور فقہائے احناف میں تھے، اس لئے اس فن سے ان کو فطری تعلق تھا، اس کا ثبوت ان کی کتاب المُفسّر اور اس کی شرح المحکم سے ملتا ہے اور معقولات ومنقولات میں ان کی جامعیت ان شروح وحواشی سے ظاہر ہوتی ہے جو انھوں نے مختلف کتب کلامیہ ومعقولیہ پر لکھے ہیں، حافظ صاحب سلوک ومعرفت کی بزم میں آخر عمر میں داخل ہوئے اور اس کے گوہر شب چراغ بنے اور شیخ محب اللہ الہ آبادی کے رسالہ تسویہ کی شرح لکھی جو بڑی سخت مختلف فیہ کتاب تھی اور اس پر شدید ہنگامہ بپا تھا،

لکھنؤ کی صدارت عالمگیر حافظ صاحب کے والد مفتی نور اللہ کے قدر دانوں میں تھا اور بنارس میں ان کے لئے مسجد اور خانقاہ تعمیر کی تھی اور وہاں کے عہدہ قضا پر ان کو مامور کیا تھا، حافظ صاحب بھی فراغت کے بعد سلطان کی عنایات وتوجہات

۱ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۷، ۲ نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۳۹

شاہی کے مستحق قرار پائے اور اس نے ان کو لکھنؤ کی صدارت عطا کی، سبحۃ المرجان میں ہے،

وکان الحافظ متقلداً بصدارۃ	حافظ صاحب سلطان عالمگیر کی طرف
لکھنؤ من السلطان عالمگیر،	سے شہر لکھنؤ کی صدارت پر مامور تھے
وکان القاضی محب اللہ البھاری	اور قاضی محب اللہ بہاری وہاں کے
قاضیا بھا، [1]	قاضی تھے،

مآثر الکرام میں ہے،

واو چندے از خلد مکان بہ منصب	وہ کچھ دنوں خلد مکان سلطان عالمگیر
صدارتِ بلدہ لکھنؤ مامور بود اشاذ	کی طرف سے لکھنؤ کی صدارت پر فائز
الیہ بہ تقریب صدارت، و قاضی محب اللہ	تھے اس تقریب سے وہ اور عہدہ قضا کی
صاحب سلّمہ بہ تقریب قضا و ران بلدہ	تقریب قاضی محب اللہ صاحب سلّمہ
فاخرہ مجتمع بودند، [2]	اس شہر میں ایک ہی زمانہ میں تھے،

مغل دور میں صدارت کا عہدہ بڑی اہمیت رکھتا تھا، صدر صوبائی، دار الحکومت میں رہتا تھا اور پورے صوبہ کے علماء و مشائخ، ائمہ اور معذوروں کے حقوق اور ان کے سارے امور و معاملات عطیات اور وظائف وغیرہ کی نگرانی اور دیکھ بھال اسکے متعلق ہوتی تھی، قاضیوں کی کارگذاری اور ان کے استحقاق وعدم استحقاق کا نگراں اور محتسب بھی ہوتا تھا انکی تقرری بادشاہ کی طرف سے صدر الصدور کی توثیق کے بعد ہوتی تھی قاضیوں کے فرائض نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور شرعی قضایا معاملات مثلاً زوجین کے مسائل

[1] سبحۃ المرجان ص ۸۰، [2] مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۱۲،

اور قرضہ جات کے مرافعات وغیرہ کی نگرانی تک محدود تھے[1]، اس لئے حافظ امان اللہ کا عہدہ ان کے استاد بھائی قاضی محب اللہ بہاری سے بڑھا ہوا تھا، قاضی محب اللہ بہاری فراغت کے بعد سلطان عالمگیر کی خدمت میں دکن جاکر لکھنؤ کے عہدہ قضا کا پروانہ لائے تھے اور حافظ صاحب کو بغیر کسی سعی و کوشش کے یہ منصب ملا تھا اسی اعتبار سے ان کا پلہ بھاری تھا مگر علم و تحقیق فضل و کمال میں دونوں برابر تھے اور ملا قطب الدین شمس آبادی کے فیض سے معقولات و منقولات میں ید طولیٰ رکھتے تھے،

حافظ امان اللہ اور قاضی محب اللہ کے درمیان علمی مباحث	لکھنؤ میں تقرری کے بعد دونوں میں بحث و مباحثہ اور علمی مناقشہ کا دروازہ کھل گیا اور لکھنؤ علمی مباحثہ

کا اکھاڑہ بن گیا، جانبین سے رسالہ بازیاں ہوئیں اور ایک نے دوسرے کے رد میں صفحات کے صفحات سیاہ کر دیئے، تذکرہ نویسوں نے اس نوک جھونک کا ذکر خاص طور سے کیا ہے، سبحۃ المرجان میں ہے،

وکانا یجتمعان وتجری بینھما	دونوں حضرات لکھنؤ میں رہتے تھے اور
مباحث علمیۃ [2]	انمیں علمی بحثیں جاری رہتی تھیں،

مآثر الکرام میں ہے وہ باہم طریق مباحثہ علمی سلوک می داشتند" (ج ۱ ص ۲۱۲) ان مباحث کی کثرت کا اندازہ نزہۃ الخواطر کی اس تصریح سے ہوتا ہے،

فجرت بینھما من المباحثات	ان دونوں کے درمیان اس قدر
والمطارحات ما تفعم بھا	زیادہ مباحثے اور مناظرے چلے کر ان سے
بطون الصفحات، [3]	صفحات کے صفحات بھر جائیں گے،

[1] الہند فی العہد الاسلامی ص ۳۲۷، [2] سبحۃ المرجان ص ۸۰، [3] نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۳۹،

ان مباحثوں کی تفصیل کتابوں میں درج نہیں ہے، اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ کن کن مسائل پر بحثیں ہوتی تھیں، قیاس ہے کہ اس زمانہ کے ذوق کے مطابق ان کا تعلق فقہ، اصول فقہ، کلام اور منطق و فلسفہ کے مسائل سے رہا ہوگا، لکھنؤ کی صدارت اور عہدۂ قضاء سے دونوں حضرات جلد ہی الگ ہوگئے، مگر بحث و مباحثہ کی سرگرمی اس کے بعد بھی جاری رہی اور تصانیف میں رد و قدح کا سلسلہ چلتا رہا، قاضی محب اللہ نے اپنی بعض کتابوں میں "قال الفاضل البنارسی" سے حافظ صاحب ہی کو مراد لیا ہے،

بنارس میں تدریسی خدمات

غالباً اسی منافشہ کے نتیجہ میں دونوں حضرات بہت جلد اپنے عہدہ سے الگ ہوگئے، حافظ صاحب نے اپنے وطن بنارس میں مدرسہ قائم کرکے درس و تدریس کا سلسلہ جاری کیا اور قاضی محب اللہ نے شاہی عہدے حاصل کئے، بقول آزاد،

آخر طالع قاضی محب اللہ عروج کرد، و	قاضی محب اللہ کو بڑا عروج حاصل ہوا
بہ مرحمت منصب بلند و صدارت مجموعہ	اور وہ بلند منصب کے مالک اور پورے
ممالک ہندوستان، و خطاب "فاضل خاں"	ہندوستان کے صدر اور "فاضل خاں"
سرمایہ مباہات بدست آورد،[۱]	کے خطاب سے سرفراز ہوئے،

قاضی صاحب معزولی کے بعد دوبارہ دکن گئے، اور حیدرآباد منصب قضا پر مامور ہوئے پھر سلطان عالمگیر کے پوتے رفیع القدر بن شاہ عالم کے معلم بنائے گئے اور جب سلطان عالمگیر نے شاہ عالم کو کابل کا صوبہ دار بنا کر بھیجا تو قاضی صاحب بھی اسکے ساتھ کابل گئے، اسی ۱۱۱۸ھ میں عالمگیر کی وفات اور شاہ عالم کی تخت نشینی کے بعد ان کو

[۱] مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۱۱،

بڑا عروج حاصل ہوا اور وہ پورے ہندوستان کے صدر الصدور کے جلیل القدر منصب پر سرفراز ہوئے، ان کے حریف حافظ صاحب اس سے پہلے صرف صوبہ اودھ کے صدر تھے مگر اس کے بعد قاضی صاحب کی حیات مستعار کے دن بہت جلد پورے ہوگئے اور ۱۱۱۹ھ میں انھوں نے وفات پائی، مآثر الکرام کے اس بیان سے کہ "داو چندے از خلد مکان بہ منصب صدارت بلدۂ لکھنؤ مامور بود" اندازہ ہوتا ہے کہ حافظ صاحب زیادہ دنوں تک لکھنؤ کی صدارت کے عہدے پر نہیں رہ سکے اور اس سے علیحدہ ہوتے ہی اپنے وطن بنارس آکر مدرسہ قائم کیا اور درس و تدریس میں ایسے منہمک ہوئے کہ پھر کہیں کا رخ نہیں کیا، ان کے والد کے زمانہ سے ان کے خاندان پر جو شاہی عنایات تھیں ان ہی پر قانع رہ کر علمی و دینی خدمت میں لگے رہے، عمر کے آخری حصہ میں بعض حوادث کی وجہ سے دہلی گئے، مگر جلد ہی بنارس واپس آگئے،

افسوس کہ حافظ صاحب کی تعلیمی و تدریسی خدمات کی تفصیلات کتابوں میں نہیں ملتیں حالانکہ ایک مدت دراز تک انھوں نے تشنگان علم و فن کو سیراب کیا اور بہتوں نے آپ سے تحصیل علم کی، البتہ حضرت نظام الدین فرنگی محلی رح (۱۱۶۱ھ) کے بارے میں مآثر الکرام میں تصریح ہے کہ وہ حافظ صاحب کے خاص شاگردوں میں ہیں اور اپنے والد کی شہادت کے بعد انہی سے تحصیل علم کی تھی،

تحصیل علوم متعارفہ بعد از شہادت	انھوں نے اپنے والد کی شہادت کے بعد
والد ماجد خود از حافظ امان اللہ	حافظ امان اللہ بنارسی اور مولوی قطب
بنارسی و مولوی قطب الدین محمود،[۱]	الدین سے علوم متعارفہ کی تعلیم حاصل کی،

[۱] مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۲۱، تذکرۂ علمائے ہند ص ۲۷

ملا نظام الدین کے والد ماجد حضرت ملا قطب الدین سہالی کی شہادت ۱۱۰۳ھ میں ہوئی، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سے پہلے حافظ صاحب لکھنؤ کی صدارت سے الگ ہو چکے تھے اور اس وقت ان کی تدریسی خدمات کا شہرہ دور دور تک پھیل چکا تھا،

نزہتہ الخواطر میں ہے کہ اس وقت ملا نظام الدین کی عمر چودہ پندرہ سال کی تھی، قیام فرنگی محل لکھنؤ کے بعد جب اطمینان نصیب ہوا تو انھوں نے سب سے پہلے جائس جاکر ملا علی قلی جائسی سے کتب درسیہ پڑھیں، پھر بنارس میں حافظ صاحب سے شرح مواقف کا درس لیا،

ثم ذھب الی بلدۃ بنارس	جائس کے بعد بنارس جاکر حافظ امان اللہ
وتلمذ علی الحافظ امان اللہ	کی شاگردی کی اور ان سے شرح مواقف
بن نور اللہ البنارسی وقرع	کا درس لیا،
علیہ شرح المواقف [۱]	(نزہتہ الخواطر ج ۶ ص ۳۸۴)

ملا نظام الدین جیسے فاضل روزگار کا حافظ صاحب کی درسگاہ سے پیدا ہونا انکے دریائے فیض کا سب سے بڑا ثبوت ہے،

---

[۱] نزہتہ الخواطر ج ۶ ص ۳۸۴،

قرون وسطیٰ کی تاریخ اور مورخین کا ایک تنقیدی جائزہ

از جناب الطاف حسین خاں شروانی اسلامیہ کالج اٹاوہ

(۳)

مسلمان حکمرانوں پر ہندو بیزاری کا الزام

اس کی تردید سے پہلے تزک جہانگیری سے ایک رباعی پیش کی جاتی ہے،

بہر نگہبانی خلق خدا	شب نکنم دیدہ بخواب آشنا
از پے آسودگی جملہ تن	رنج پسندم بر تن خویشتن

اس رباعی میں جہانگیر نے جس خلق خدا کا تذکرہ کیا ہے اس کی تقریباً اسی فیصدی آبادی ہندو تھی اس کے باوجود انگریزوں نے مسلمان بادشاہوں پر ہندو بیزاری کا الزام لگایا ان میں علاء الدین خلجی، محمد بن تغلق اور اورنگ زیب سرفہرست ہیں، لیکن تاریخی شواہد اسکے خلاف ہیں، علاء الدین کے عہد میں ہندو جوتشیوں کا احترام کیا جاتا تھا[۱]، علائی سکوں پر سنسکرت کی عبارت درج ہوتی تھی اور شاہی جشنوں کے موقع پر ہندو مسلمان عوام محلات شاہی میں آتے تھے[۲]، شادی اور بیاہ میں ہندوانہ طور طریقے اپنائے جاتے تھے[۳]، علاء الدین کی انصاف پسندی کا تذکرہ خسرو جیسے شاعر نے

---

[۱] تاریخ فیروز شاہی ص ۳۶۶،۷، [۲] تاریخ مبارک شاہی ص ۷۹، [۳] دول رانی خضر خاں علی گڈھ اڈیشن ص ۱۵۲ .

جنکو ہندو بھی مانتے ہیں، کیا ہے، فرماتے ہیں ؎

(۱) چو عدلش ذرہ ذرہ فاش گشتہ — دہانِ فتنہ پر خشخاش گشتہ
زعدلش جانِ مظلوماں سحرگاہ — فرامش کردہ تیر اندازی آہ
ترازو راست انصافش جہانگیر — کہ ہم سنگست در روئے چاکر و میر
زبس راد و رادو بس کز بداں رفت — ہمہ جا دزد مرد و پاسباں خفت
جہاں را خلعت امن آنچناں داد — کہ تیغ از ننگ عریانی شد آزاد
ہمیشہ ختمش در چارہ سازی — بظالم سوزی و عاجز نوازی[1]

(۲) حسن دہلوی نے کئی موقعوں پر اسکے عدل و انصاف کا ذکر کیا ہے،

درین میزاں کہ عدلش شاہ آنرا راست میداند

بیک پلہ مواجب ہیں بدیگر پلہ انعامش[2]

زعدل او تخلائے عرب شدہ حیراں

چو از کمال جہانگیریش ملوک عجم[3]

فدائیگان سلاطین علائے دین محمد

کشید دائرہ عدل گرد مرکز عالم[4]

علاء الدین کے عہد میں مخلوق خدا کو بڑی راحت نصیب تھی اور سماج کا ہر سے کمتر طبقہ بھی آرام سے زندگی گذارتا تھا،[5]

مسلمان بادشاہوں میں محمد بن تغلق سب سے بد نصیب حکمراں تھا۔ یہ اپنی

[1] دیول رانی خضر خاں، علی گڈھ اڈیشن، ص ۱۰، نیز دیکھئے، خزائن الفتوح علی گڈھ ۱۹۲۷ء ص ۲۷،
[2] دیوان حسن سنجزی دہلوی، ص ۲۰۵، [3] ایضاً ص ۷، [4]، [5] خیر المجالس، اردو ترجمہ، ص ۲۹۰،

روشن دماغی کے اعتبار سے وقت سے پہلے پیدا ہوا، اس کو دو سو سال بعد شیر شاہ سوری کا جانشین ہونا چاہئے تھا، اس سے مورخ[1] اس لئے خفا ہوئے کہ یہ انکو خوش نہ رکھ سکا، شعراء[2] اس لئے خفا ہوئے کہ اس میں مذہبی رواداری تھی اور اپنی قصیدہ خوانی پسند نہ تھی، اس کے عہد کا سیاح ابن بطوطہ اس لئے ناراض ہوا کہ اس کی عقلیت پسندی اس کو ناگوار تھی، اس سے کام سے کر انگریز مورخوں نے تعصب اور ظلم وستم کی ایک گمراہ کن داستان محمد بن تغلق کے خلاف کھڑی کر دی لیکن مورخوں اور تذکرہ نگاروں کی تصانیف اور درویشوں و شعراء کے ملفوظات و دواوین[3] میں اس بادشاہ کی رواداری، انصاف پسندی اور ہندو نوازی کی مثالیں بھی ملتی ہیں، محمد بن تغلق کے عہد میں ہندوؤں سے میل جول اس درجہ بڑھ گیا تھا کہ شادی و بیاہ میں ہندوانہ رسوم ادا کئے جاتے تھے، ابن بطوطہ نے محمد بن تغلق کی بہن کی شادی کی جن رسوم کا ذکر کیا ہے اس میں ہندو اثرات نمایاں نظر آتے ہیں[4] مولانا سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں "ہندوؤں کے ساتھ ازدواجی تعلقات کا سلسلہ بھی اسی تغلق خاندان سے شروع ہوتا ہے"[5] محمد بن تغلق کے ہندو نجومیوں، جوگیوں اور ہندو اور جینی فنکاروں سے گہرے تعلقات تھے،[6] مولانا عصامی لکھتے ہیں :

[1] اس سلسلہ میں دیکھئے: سلطان محمد بن تغلق کی سیرت تاریخ فیروز شاہی کی روشنی میں از رسالہ مصنف، علیگڈھ، دسمبر ۱۹۶۲ء [2] مولانا عصامی، [3] دیکھئے قصائد بدر چاچ، مطبوعہ لکھنؤ ۱۲۷۹ء، [4] عجائب الاسفار جلد دوم ص ۱۲۵،
[5] مقالات سلیمان حصہ اول ص ۱۷، ۴، [6] دیکھئے "فارسی کی ہندوانہ تصانیف" از ڈاکٹر بنارسی داس، اورینٹل کالج میگزین (ضمیمہ) اگست ۱۹۴۲ء ص ۳۵، ۳۶، نیز دیکھئے "محمد بن تغلق کی ہندو نوازی" آئینہ حقیقت نما، جلد دوم ص ۲۱

ابا جوگیا گشتہ خلوت گرا — بدل راہ کفار را دادہ جا[1]

انصاف پسندی کا جہانتک تعلق ہے ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ ایک ہندو کے استغاثہ پر بادشاہ قاضی کی عدالت میں بحیثیت ملزم حاضر ہوا تھا،[2] اسی کا بیان ہے کہ جب بادشاہ دولت آباد میں تھا تو روزانہ گنگا جل اس کے استعمال کے لئے پہونچایا جاتا تھا،[3] بادشاہ ہندوؤں کی تہواروں میں شرکت کرتا تھا، سہ

جماعت بجمعہ در انداختہ — ابا ہندواں ہولئی باختہ[4]

انگریز مورخین نے سب سے زیادہ اورنگ زیب کو بدنام کرنے کی کوشش کی ہے، انکی تقلید ہندو مورخین نے بھی کی، ممکن ہے اس قسم کے کچھ واقعات بھی ملجائیں لیکن اسکے بالمقابل اس کی ہندو نوازی کے بھی بکثرت واقعات ملتے ہیں، اس کے زمانہ میں ۶۷ ہندو امراء ہفت ہزاری کے منصب پر سرفراز تھے، مسلمان اتنی تعداد میں اس منصب پر نہ تھے،[5] اورنگ زیب کے عہد کے ہندو اہل قلم جن القاب و آداب اور جن اوصاف سے اُسے یاد کرتے ہیں اس سے اس کی انصاف پسندی اور رواداری کا احساس ہوتا ہے،[6] بہاری لال نے ۱۰۹۶ھ میں سوبھا سکھ پنڈت کی مدد سے سنسکرت کی ایک کتاب کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا جو ندت اچھرا کے نام سے جامعہ دہلی کے کتب خانہ میں محفوظ ہے، اسکے

لہ فتوح السلاطین ص ۴۹۱، کہ عجائب الاسفار ص ۱۳۰، سہ ایضاً جلد دوم ص ۳، ۴ہ فتوح السلاطین ص ۴۹۱، ۵ہ ملاحظہ ہو: عہد عالمگیر کے تین ہندو مورخ، عالم گیر لاہور، جلد: شمارہ ۱، ۶ہ دیکھئے،

Alamgir's Tolerance in the light of the contemporary Jain Literature, by Jnan chandra, Journal of the Pakistan Historical society. Vol. VI No. 4, 1958, Vol. VII No. 1, 1959.

۷ہ مولانا سید سلیمان ندوی نے مقالات سلیمان حصہ اول تاریخی میں لال بہاری لکھا ہے لیکن میرے مسودہ پر محترمی جناب ڈاکٹر تاراچند صاحب نے بہاری لال تجویز فرمایا ہے،

دیباچہ میں لکھتا ہے،

"اکنوں کہ دریں عہد بادشاہ خلافت پناہ، عادل، مظفر،...... مجسم داد و کرم قاطع آثار جفا و ستم...... ابو المظفر محی الدین اورنگ زیب بہادر عالمگیر بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ و سلطانہ کہ دورش چوں قدح پُر نشاط، و زمانش مانند ایام شباب پر سرور و انبساط، روزبازار فضل و دانش است، ہندی نژادان فارسی دوست را بنظم و نثر از حد بیشتر است"[1]

اورنگ زیب کی ہندو نوازی اور رواداری کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ آج بھی ہندوستان کے بہت سے مندروں میں اس کی دی ہوئی مدد معاش کے فرمان موجود ہیں،[2] تیج بہادر سنہا صاحب فرماتے ہیں:

ان ہندو مندروں کے لئے جنھیں اسلام کے بنیادی عقیدے کے خلاف بت پرستی ہوتی ہے مسلمان حکمرانوں نے فراخدلی سے جاگیریں عطا کی ہیں تاریخ کے نہایت بدنام اور متعصب ہیرو اورنگ زیب کے چھ سو سے زیادہ فرمان برآمد ہو چکے ہیں جن کے ذریعہ ہندو مندروں کے اخراجات چلانے کے لئے بیش قیمت جاگیریں دی گئی تھیں،[3]

لہ مقالات سلیمان حصہ اول، ص ۲۵۴-۲۵۵، ۲ہ ہمارے ضلع فتحپور میں دریائے گنگا کے کنارے آباد ایک برہمن خاندان کے پاس عالمگیر کا مدد معاش کا دیا ہوا ایک فرمان موجود ہے، ایک مقدمہ کے سلسلہ میں جس کے وکیل میرے والد (محمود حسن خان شروانی مرحوم) تھے یہ فرمان عدالت میں داخل کیا گیا تھا اور برہمن کامیاب ہوا، ۳ہ روزنامہ دعوت (سہ روزہ اڈیشن) دہلی ۱۶ر مئی ۶۹ء نیز دیکھئے:-

(۱) Moghals and the Jogis of Jakhbar, Indian Institute of Advanced study, Simla.

(۲) مقالہ "عالم گیر کے عہد میں مندروں کا انہدام" معارف ستمبر ۱۹۶۳ء،

ڈاکٹر راجندر پرشاد سابق صدر جمہوریۂ ہند لکھتے ہیں:

اگر کوئی ریسرچ اسکالر ان مندروں اور مٹھوں وغیرہ کی فہرست تیار کرے جنھیں اس ملک کے مسلمان بادشاہوں نے جاگیریں عطا کی تھیں تو یہ فہرست بہت طویل ہوگی۔[۵]

جب کبھی کسی مسلمان حکمراں نے غیر مسلم عوام کے خلاف قدم اٹھانا چاہا تو وہ علماء و صوفیائے کرام سامنے آئے جن کا مسلک یہ تھا،

(۱) مسلمانان بر دین خود باشند و ہندواں بر کیش خود۔ آیت لکم دینکم ولی دین بیان ایں معنی است۔[۶]

(۲) در طریق ماہیست کہ با مسلمان و ہنود صلح باید داشت و ایں بیت شاہد آوردند

حافظا گر وصل خواہی صلح کن با خاص و عام
با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام[۷]

مسلمانوں پر وطن دشمنی کا الزام

انگریزوں نے مسلمانوں پر وطن دشمنی کا بھی الزام لگایا ہے جو سراسر غلط ہے، ایک حدیث میں وطن کی محبت کو ایمان کا جز قرار دیا گیا ہے، حب الوطن من الایمان۔[۸]

خسرو کہتے ہیں:

دیں ز رسول آمدہ کامی زمرہ دین　　حب وطن ہست ز ایمان بہ یقیں[۹]

---

[۵] India divided اس کتاب کے خاص خاص حصوں کا ترجمہ "مسلمان حکمرانوں کے عہد کی ایک جھلک" سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب نے کیا ہے، [۶] مکتوبات شیخ احمد سرہندی جلد اول، ص ۴۵ بحوالہ Naqshbandi's influence on Moghal Rulers and Politics by prof. K. A. Nizami Islamic culture, Jan. 1965, P.45 [۷] ملفوظات حضرت شاہ سلیمان تونسوی بحوالہ تاریخ مشائخ چشت ص ۶۵۱، [۸] محدثین نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے لیکن باوجود اس کے وطن کے متعلق مسلمانوں کے نقطہ نظر کا اندازہ ہوتا ہے، [۹] مثنوی نہ سپہر

(باقی حاشیہ ص ۱۲۱ پر)

مولانا شبلی فرماتے ہیں،

اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کی فضیلت نے مذہبی حیثیت پیدا کی اور حدیث و تفسیر کی مقدس کتابوں میں اس قسم کی روایتیں درج کی ہیں۔[۱۰]

یہ ملک ہمیشہ سے مسلمانوں کا منظور نظر رہا،

کانش درون میدہد از جنت اثر　　لیک بہ ہند است نسیمش دگر
ہند تواں گفت کہ خلد است بدیں[۱۱]　　زاں سبب خاص بر اصحاب یقیں

مسلمانوں کے حب وطن کا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے اجنبی حکمرانوں کی طرح ہندوستان کو محض مال غنیمت نہیں سمجھا بلکہ اس کو اپنا وطن بنالیا، یہیں پیدا ہوئے اور اسی کی خاک کا پیوند ہوئے،

ہندوستان سے مسلمانوں کا تعلق اور اسکی تعمیر و ترقی میں ان کا حصہ

مسلمان حکمرانوں اور امراء نے اس سرزمین کو ہر حیثیت سے سنوارا ہے اور نکھارا ہے، ایران و ترکستان کے گل بوٹوں سے یہاں کے چمن میں اضافے کئے ہیں،[۱۲] سمرقند و شیراز کے علماء کو یہاں بلاکر ہندوستانیوں کے ذہنی دریچوں کو روشن کیا ہے۔[۱۳]

جاں نثاروں نے ترے کر دئے جنگل آباد
خاک اڑتی تھی جہاں اہل وفا سے پہلے

(بقیہ حاشیہ ص ۱۲۰) بہ تصحیح ڈاکٹر وحید مرزا، کلکتہ ۱۹۴۸ء ص ۱۵۰، [۱۰] مقالات شبلی تاریخی حصہ دوم جلد ششم صفحہ ۲۲۳-۲۲۴، [۱۱] نہ سپہر ص ۱۵۰، [۱۲] ابو الفضل نے آئین اکبری میں ایران و ترکستان سے لائے ہوئے پھولوں کی فہرست دی ہے، دیکھئے: The A'in-i-Akbari, Translated by H. Block-mann Delhi, 1965, P 93, نیز دیکھئے: اسلامی ہند کے تمدنی کارنامے، مصنفہ مولانا عبد السلام ندوی معارف اگست تا نومبر ۱۹۶۹ء، [۱۳] تفصیل کے لئے دیکھئے، ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت جلد اول دہلی ۱۹۶۶ء،

یہاں کے فنکاروں کو کسب علوم کے لئے ایران بھیجا،

(۱) عبدالباقی نہاوندی لکھتا ہے:

ایران مکتب خانہ ہندوستان است و مستعدان کسب حیثیات در انجامی
نمایند کہ در ہندوستان در مجلس سامی ایں سپہ سالار بکار برند[۱]

(۲) عبدالرحمن چغتائی لکھتے ہیں:

ہندی آرٹسٹوں نے ایرانی آرٹسٹوں سے فن سیکھا اور مغل دربار پر چھا گئے، میر سید علی تبریزی اور استاد عبدالصمد شیرازی کی تعلیم نے انھیں کہیں سے کہیں پہنچا دیا، جہانگیر نے بعض ہندو آرٹسٹوں کو ان کی قابلیت کی بنا پر تعلیم کے لئے ایران بھیجا تھا۔ ان پر بڑی بڑی نوازشیں کی گئیں تاکہ یہاں کا فن مصوری درجہ کمال حاصل کر سکے[۲]

فن تعمیر، موسیقی اور شعر و سخن وغیرہ سارے فنون لطیفہ میں ایران و ترکستان کا تازہ خون شامل کیا گیا، خطاطی و تزئین کاری مسلمان اپنے ساتھ لائے اور اس سرزمین کو لالہ و نسترن کا تختہ بنا دیا،

اسلام امن و صلح کا مذہب ہے، اس نے انسانیت کے رشتے سے سارے انسانوں کو بھائی قرار دیا ہے اور سب کے ساتھ محبت اور رواداری کی تعلیم دی "کونوا عباد اللہ اخوانا" اگر کچھ حکمرانوں نے اپنے سیاسی مصالح کی بنا پر اس پر عمل نہیں کیا تو یہ انکا قصور ہے لیکن اگر کچھ علمائے حق اور صوفیائے کرام کا ایک طبقہ جو اسلامی تعلیمات کے سچے حامل تھے ہمیشہ ان کی اصلاح کیلئے

---

[۱] بحوالہ ایران میں طبی تعلیم کا نظام (عہد صفویہ میں) مصنفہ کوثر چاند پوری، [۲] (فنون لطیفہ اور تذکرۂ اسلام
تذکرہ عرشی دہلی، ۱۹۶۵ء

موجود رہا ہے جو انکو راہ راست دکھاتا رہتا تھا، ان کے یہاں ظاہر کے ساتھ باطنی اصلاح پر زیادہ زور تھا، ان کے دروازے ہر مذہب و ملت کے لوگوں کے لئے کھلے رہتے تھے، انکا نظام سارے ہندوستان میں پھیلا ہوا تھا، دہلی، ملتان، لاہور، سرہند، اجمیر، ہانسی، بدایوں، اجودھن اور ناگور انکے خاص مرکز تھے، جہاں وہ اصلاح اخلاق و تعمیر کردار کا کام انجام دیتے اور شکستہ دلوں کی دلداری کرتے تھے[۱]۔۔۔۔ ہندو درویشوں نے بھی اس کام میں ان کا ہاتھ بٹایا اور بھکتی تحریک[۲] کا مقصد بھی یہی تھا، اس کے اثر سے ہندوستان کے زمین و آسمان بدل گئے۔

گر قدوم شاں مثال بوستاں جنت الماویٰ شدہ ہندوستان[۳]

خسرو نے بھی اس کو جنت نشان قرار دیا ہے،

بہشتے فرض کن ہندوستان را کز آنجا نسبت است ایں بوستاں[۴]

کشور ہند است بہشتے بزمیں صحبتش اینک برخ صفحہ ببیں[۵]

ان صوفیائے کرام نے ہندوستانی سماج کے سدھار کے لئے بڑی عظیم جد و جہد کی اور سارے انسانوں کو برابری کا درجہ دیا، شیخ حمید الدین ناگوری ناگور کے ایک ہندو کی نسبت فرماتے تھے کہ خدا کا ولی ہے[۶]، صوفیائے کرام اپنے عہد کے حکمرانوں کو بھی ہندو اور مسلمان عوام کے ساتھ عدل و انصاف کی تعلیم دیتے تھے،

(۱) خواجہ قطب الدین بختیار کاکی التمش کو ہدایت کرتے ہیں:

---

[۱] حضرت نظام الدین اولیاء فرماتے ہیں: بزرگوں نے بطور مجاہد فرمایا ہے کہ شکستہ دلوں کی دلداری معرفت ہے (ذر نظامی) اردو ترجمہ ص ۵۱، [۲] جب صوفیائے کرام نے اپنی تعلیم (توحید و مساوات) کو عوام میں پھیلایا تو بھکتی کے رہنماؤں نے بھی اپنی بھولی ہوئی تعلیم کو دوبارہ زندہ کیا، خدا کی عبادت اور محنت پر زور دیا اور چھوت چھات اور ذات پات کی مخالفت کی، عہد سلاطین دہلی کے خاص بھکتی کے رہنما حسب ذیل ہیں: (۱) رامانند، ولبھ اچاریہ، چیتنیہ، نام دیو، کبیر اور گرو نانک، [۳] سیر العارفین، شیخ جمالی، دہلی ۱۳۱۱ھ ص ۴۸ [۴] دولرانی خضر خاں، ص ۴۴، [۵] نہ سپہر ص ۱۵۱، [۶] فوائد الفواد، ترجمہ غلام احمد خاں بریاں ص ۱۶۴ نیز دیکھئے سیر العارفین ص ۱۴،

"اے والیٔ دہلی! ...... با خلق نیکوی کنی رعیت پرور باشی ہر کہ با رعیت رعایت کند و با خلق نیکوئی کند خدائے تعالے او را نگاہ دارد و جملہ اعداء او را دوست دارد"[۱]

(۲) حضرت بو علی شاہ قلندرؒ اپنے ایک خط میں علاء الدین خلجی کو لکھتے ہیں:

"علاء الدین ...... مقرر دانند کہ با بندگان خدائے نیکو کنند"[۲]

(۳) حضرت امیر خسروؒ اپنے دور کے سلاطین کو عدل و انصاف اور عوام کی بھلائی کی طرف توجہ دلاتے رہتے تھے، قطب الدین مبارک خلجی کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:

بخشش آں شد کہ نماید مدام	جہد در آسودگی خاص و عام
بر ہمہ داد بہ بیاباں و کاخ	جا خوش و رہ ایمن و نعمت فراخ
آنچہ بفہرست رقم یافت چست	باز نمایم بہ بیان درست[۳]

علاء الدین خلجی کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں:

یاد کن زاں گدائے بے توشہ	کہ شب افتد گرسنہ در گوشہ
کہ چو فردا شمار کار کند	اول از مفلساں شمار کند
پیل چوں مور را تہ پا سود	پرسش از پیلباں خواہد بود[۴]

(۴) ۷۵۲ھ میں فیروز شاہ تغلق جب تخت نشین ہوا تو حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ نے کہلا بھیجا کہ بادشاہ وعدہ کرے کہ مخلوق خدا کے ساتھ انصاف کریگا ورنہ میں ان غریب عوام کے لئے خدا سے دوسرا فرماں روا طلب کر دوں، فیروز شاہ تغلق

---

۱ سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات ص ۱۰۰، ۲ ایضاً ص ۲۷۹ بعض کتابوں میں یہ واقعہ بھی لکھا ہے کہ حضرت بو علی شاہ قلندر کے ایک غلام کو کوتوال نے پیٹ ڈالا تو انہوں نے شاہ وقت کو لکھا: "بازخواں ایں عالم بدگہر سے + ورنہ بخشم ملک تو با دگرے"
۳ نہ سپہر ص ۲۲۹-۲۳۰ ۴ بحوالہ حیات خسرو، مصنفہ محمد سعید احمد مارہروی آگرہ ۱۹۰۳ء ص ۵۱

نے عدل کرنے کا وعدہ کیا، اس پر حضرت چراغ دہلویؒ نے اسے دعائے خیر دی[۱]

(۵) حضرت مخدوم جہانیاںؒ نے ان بیس ٹیکسوں کی مخالفت کی تھی جو عوام پر بوجھ بنے ہوئے تھے اور فیروز شاہ نے ان ٹیکسوں کو معاف کر دیا تھا،

(۶) حضرت شیخ نجم الدینؒ (متوفی ۱۱۳۹ھ) اورنگ زیب کو لکھتے ہیں:

بادشاہ آپ کو اللہ تعالے نے اپنی کثیر مخلوق کا نگراں مقرر کیا ہے اور آپ انکے حقوق کے ذمہ دار ہیں، اگر آپ کو تکلیف پہنچ جائے تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن رعیت کو تکلیف نہ پہونچے[۲]

صوفیہ مظلوم کی دادرسی کی خاطر درباروں میں جانا اپنے لئے ثواب دارین سمجھتے تھے[۳] اور عوام کی خدمت کرنا اپنا فرض اولین جانتے تھے[۴]، قرون وسطیٰ میں عوام کے صحیح رہنما ہی صوفیہ تھے جب کبھی انکو کسی پر ظلم کی اطلاع ہوتی تھی تو ان کے چہرے آنسو سے تر ہو جاتے تھے، حضرت نظام الدین اولیاؒ کے ان آنسوؤں کو کیسے بھلایا جا سکتا ہے جو ایک غریب ہندو لڑکی کے لئے نکلے تھے جسے اس کے ماں باپ سے چھڑا کر پانچ ٹنکوں میں دیوگیر میں فروخت کیا گیا تھا[۵]

ان درویشوں کی چھ سو سالہ جدوجہد رنگ لائی اور یہاں کی فضا میں توحید کے ترانے گائے جانے لگے اہل قلم اس روحانی تحریک سے اتنا متاثر ہوئے کہ اٹھارویں و انیسویں صدی

---

۱ تاریخ فیروز شاہی شمس سراج عفیف ص ۲۹، ۲ رسالہ آستانہ، مارچ ۱۹۵۰ء ص ۵۰، ۳ سیر العارفین ص ۱۵۷، ۴ حضرت چراغ دہلویؒ فرماتے ہیں "دن بھر مخلوق کے ساتھ رہتا ہوں بلکہ قیلولہ بھی اکثر میسر نہیں ہوتا"، خیر المجالس (اردو ترجمہ) ص ۵۹، ۵ دیکھئے: محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیا - حیات و تعلیمات، مصنفہ پروفیسر محمد حبیب مرحوم،

میں انھوں نے اپنی تصانیف میں ہندوؤں کے لئے لفظ کافر[1] کے استعمال سے اجتناب کیا،[2]
حالانکہ ہندو مصنفین اپنے ہندو بھائیوں کے لئے لفظ کافر بلا تکلف استعمال کرتے رہے،[3]
متاخرین میں حضرت مظہر جانجاناں ہندوؤں کو موحد مانتے تھے، اس کا اثر ہندوؤں
پر یہ پڑا کہ وہ اپنی فارسی تصانیف کی ابتدا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے کرنے لگے،
خسرو سے اقبال تک ہم کو ہند اور ہندوستان سے محبت ہی کی تلقین ملتی ہے،

۵ خورشید پرست شد مسلمان	زیں ہندوگان شوخ و سادہ[4]
اے کہ زبت طعنہ بہ ہندو بری	ہم زوے آموز پرستش گری خسرو

تو از ملک عراقی واز گوں کن عادت پیشیں
اگر خواہی کہ حسن رونق ہندوستاں بینی (عرفی)

می ندانی خطۂ ہندوستاں	آں عزیز خاطر صاحب (اقبال)

دیکھئے ہندوستان کو امیر خسرو، تلسی داس، ملک محمد جائسی، عبدالرحیم خانخاناں
فیضی اور مظہر جانجاناں کب نصیب ہوتے ہیں۔[5]

خزاں رسید گلستاں بآں جمال نماند	سماع بلبل شوریدہ رفت و حال نماند
نشان لالۂ ایں باغ از کہ می پرسی	بروکہ آنچہ تو دیدی بجز خیال نماند

ہمارے وہ روشن ضمیر مفکرین جنھوں نے رواداری سماج کی تشکیل دینے میں اپنی ساری
توانائیاں صرف کر دی تھیں، اگر زندہ ہو جائیں تو انھیں یہ دیکھ کر انتہائی قلق ہوگا کہ آج کا

---

[1] صوفیائے کرام کے ملفوظات کے صفحات الٹتے جائیے آپ کو ان کی زبان سے لفظ کافر نہیں
[2] ملے گا کسی انسان کو کافر کہنا ان کے مسلک کے خلاف تھا، حرف بد را بلب آوردن خطاست[5] کافر و مومن ہمہ
خلق خدا ست۔ [3] وقائع عالم شاہی، بحوالہ ہندو تہذیب اور مسلمان برہان، جون ۱۹۷۲ء، [4] قرآن السعدین ص ۲۷

ان کے خوابوں کے ہندوستان سے بالکل مختلف ہے،
ہندوستان
مغربی تدبر نے ہمارے مذہب اور ہمارے سماج اور ہماری تعلیم کو ایسا مسخ
کر دیا ہے کہ ہم اپنی تمام قومی اور مذہبی خوبیوں سے محروم ہو گئے ہیں، دوسری قومیں
ہم سے آگے نکل چکی ہیں اور ہم ابھی اپنے چمن کے خاشاک بھی صاف نہیں کر سکے ہیں،

۵ نوبہار دیگراں آمد بہار ما بہ نگشت	ابر برگشت و ہوا برگشت و ایام بہ نگشت

بزم تیموریہ حصہ اول

بزم تیموریہ کا پہلا اڈیشن تمام عظیم مغل سلاطین بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر، شاہجہاں، عالمگیر،
ظفر شاہ آخری مغل بادشاہ اور تیموری شاہزادوں اور شاہزادیوں اور ان سب کے درباروں کے متوسل
امراء، فضلاء اور شعراء کے تذکرہ اور ان کے علمی و ادبی و شعری کمالات پر مشتمل تھا جس کو ارباب ذوق
نے بہت پسند کیا، اور اپنی کتابوں اور مضامین میں اس دور کے مستند ترین ماخذ کی حیثیت سے
اس کے حوالے دیے، اور ناقدین نے مصنف کی محنت و جانفشانی کی داد دی، اب نظر ثانی کے بعد
اس میں اس کثرت سے اضافے ہوئے اور اس کا حجم اتنا بڑھ گیا کہ قدر دانوں اور مستفیدین کی آسانی
کے لیے اس کو دو جلدوں میں کر دیا گیا، تاکہ بانی سلطنت تیموریہ سے لیکر ظفر شاہ تک کے عہد کے
علم و ادب اور شعر و سخن کا پورا مرقع نگاہوں کے سامنے آجائے، اس جلد میں جو زیر طبع ہے، تین
متقدم الذکر مغل سلاطین یعنی بابر، ہمایوں اور اکبر کے علمی ذوق اور ان کے دربار کے تمام قابل الذکر
امراء، شعراء اور فضلاء کے تذکرہ کے ساتھ ان کے علمی کمالات پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے،
خصوصاً دربار اکبری کا تو پورا مرقع نگاہوں کے سامنے آگیا ہے۔

مولفہ سید صباح الدین عبد الرحمٰن ایم اے۔

منیجر

لفظ گجری کی تحقیق

(ناقدین اردو کے نظریات کی روشنی میں)

از ڈاکٹر سید احتشام احمد صاحب ندوی

قدیم اردو زبان کے ناموں میں ایک نام گجری یا گوجری بھی ملتا ہے، یہ امر بادی النظر میں تو آسان معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تعلق ہندوستان کے مشہور صوبہ گجرات سے قائم کیا جائے اور اس رشتہ سے اس کو گجری کہا جائے، مگر یہ مسئلہ اتنا آسان نہیں ہے، چونکہ دکنی اور گجری کے علاقے ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں اس لیے ان دونوں زبانوں میں مشابہت اور اشتراک کے باعث غلط فہمی کے بڑے مواقع ہیں، اس سلسلہ میں بڑا مسئلہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جبکہ دکنی کے اساطین ادبا و شعراء اپنی زبان کو گجری کہنا شروع کر دیتے ہیں، جس کی تاویل خاصی پیچیدہ اور اہم ہے، محققین اردو نے اس بارے میں مختلف نظریات قائم کیے ہیں، اور اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کی ہے، ان نظریات کے بارے میں اختلاف کی بڑی گنجایش ہے،

اب میں اردو کے ان محققین کے افکار کا جائزہ لینا چاہتا ہوں، اس سلسلہ میں سب سے پہلا نظریہ پروفیسر محمود شیرانی کا ہے، ان کا خیال ہے کہ جب اردو دکن میں رائج ہوئی تو اس کا نام دکنی رکھا گیا اور جب وہ گجرات پہنچی تو مقامی زبان کے اثر

سے گجری کہلائی، وہ لکھتے ہیں:

"ایک دلچسپ امر یہ ہے کہ جب اہل دکن نے اردو کا نام دکنی رکھا، اہل گجرات نے اس کا نام گجراتی یا گوجری رکھدیا، لطف یہ ہے کہ خود ان ممالک کے باشندے اس کو ان ناموں سے پکارتے رہے، شیخ خوب محمد چشتی نے مثنوی خوب ترنگ ۹۸۶ھ میں لکھی ہے، اس تصنیف کی زبان گجراتی کے مقابلہ میں زیادہ تر اردو کے ذیل میں داخل ہے، لیکن شیخ اس کو گجراتی بولی کہتے ہیں

جیوں دل عرب عجم کی بات سن بولی، بولی گجرات[1]

پروفیسر شیرانی کا یہ خیال صحیح ہے کہ دکن اور گجرات دونوں نے تعلقوں کے دور کی اردو کو رواج دیا ہے، اور بعد میں اردو کے مولد میں جو تبدیلیاں ہوئیں اُن سے وہ کسی حد تک محروم رہے، البتہ شیرانی مرحوم نے اس امر کی وضاحت نہیں کی کہ برہان الدین جانم اور دوسرے دکنی ادبا نے اپنی زبان کو گجری کیوں کہا ہے، انھوں نے یہ ضرور لکھا ہے کہ دکنی ادبا نے بھی اپنی زبان کو گجری کہا ہے، مگر اس مسئلہ کے حل کرنے سے انھوں نے احتراز کیا ہے،

"گجری" کی تاویل و تفسیر میں ایک نظریہ وہ ہے جو ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے اپنی کتاب "ہندوستانی لسانیات" میں پیش کیا ہے، یہ عقل کو ... زیادہ اپیل کرتا ہے، اور واقعات سے مناسبت رکھتا ہے، اس میں اس امر کی وضاحت بھی ملتی ہے کہ دکنی شعراء نے اپنی زبان کو گوجری یا گجری کیوں کہا؟ ان کا بیان انھی کی زبان سے سنیے:

"گجرات کی سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا، شاعر اور ادیب بے سروسامانی کی حالت میں

---

[1] پنجاب میں اردو مصنفہ پروفیسر محمود خاں شیرانی، دسمبر ۲۸ء لکھنؤ، ص ۴۹

ادھر اُدھر مارے مارے پھرنے لگے، ایسے نازک موقع پر دکن کی ایک سلطنت بیجاپور کے حکمراں ابراہیم عادل شاہ ثانی نے فیاضی دکھائی اور اپنے آدمیوں کو بیش تحائف اور سوغات دے کر گجرات روانہ کیا تاکہ وہاں کے علماء اور شعراء کو بیجاپور کے دربار میں آنے کی دعوت دیں، اس طرح تھوڑے ہی عرصہ میں گجرات کی ادبی عظمت کا پرچم بیجاپور پر لہرانے لگا، مشہور و معروف ہستیوں کے علاوہ اکثر عام لوگ بھی بیجاپور آگئے، ان گجراتیوں کا اس قدر اثر ہوگیا تھا کہ بعض دکنی مصنف اپنی گجراتی آمیز ہندوستانی کو گجری کے نام سے موسوم کرنے لگے۔[1]

بظاہر یہ دلیل دل کو لگتی نظر آتی ہے، مگر پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی اس نظریہ پر تنقید کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ڈاکٹر زور کے یہ دلائل میراں جی شمس العشاق یا برہان الدین جانم کے متعلق صحیح نہیں ہو سکتے، اس لیے کہ اکبر اعظم نے مظفر شاہ والی گجرات کے مقابلہ کے لیے عبدالرحیم خانخاناں کو مامور کیا، جس نے اس کو شکست دے کر گجرات پر قبضہ کر لیا، اور مظفر شاہ کو آگرہ روانہ کر دیا، مگر اس نے اثنائے راہ میں خودکشی کر لی، گجرات کی تسخیر ۱۰۰۱ھ مطابق ۱۵۹۲ء ہوئی، اس زمانہ میں جانم کے سنہ وفات کے لحاظ سے ان انتقال ہو چکا تھا، مگر ان کی تاریخ وفات میں اختلاف ہے اس لیے ایک روایت کے مطابق وہ اس واقعے کے ۵ برس بعد تک زندہ رہے۔[2]

مولوی عبدالحق صاحب ارشاد نامہ کا سنہ تصنیف ۹۹۰ھ مطابق ۱۵۸۲ء کو قرار دیتے ہیں،[3] برہان الدین جانم کا سنہ وفات ایک روایت کے مطابق ۱۰۰۶ھ ہے،

[1] ہندوستانی لسانیات مصنفہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور ص ۱۰۳ [2] ارشاد نامہ مصنفہ برہان الدین جانم تحقیق پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی حیدرآباد ۱۹۷۱ء ص ۴۱ [3] اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا حصہ از مولوی عبدالحق طبع دوم ص ۴۵

اور ایک بیاض کی درج تاریخ کے مطابق ۹۹۲ھ ہے،[1] ان واقعات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ گجرات کی حکومت کا زوال اس وقت ہوتا ہے جب گجراتیوں کے بیجاپور آنے کا اثر حضرت جانم کی زبان پر اتنا نہیں پڑ سکتا کہ وہ اپنی زبان کو دکنی کے بجائے گجری کہنا شروع کر دیں؟

اب مسئلہ پھر وہی رہ جاتا ہے کہ دکنی شعراء نے اپنی زبان کو گجری کیوں کہا؟

اس سلسلہ میں اردو کے محقق مولوی عبدالحق بابائے اردو نے اس کے بارہ میں اپنے خیالات بڑے مدلل طریقہ سے پیش کیے ہیں، انھوں نے ان مضامین میں جو وقتاً فوقتاً قدیم اردو کے بارے میں رسالہ اردو میں لکھتے تھے، اس بحث کو بڑی اہمیت دی ہے اور بتایا ہے کہ گجراتی زبان کے اثرات اور الفاظ ہی کی بنا پر برہان الدین جانم اپنی زبان کو گجری سے تعبیر کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ برہان الدین جانم کا اپنی زبان کو خصوصیت کے ساتھ گجری کہنے سے ان کا مقصد یہ ہے کہ "اگرچہ وہ زبان جس میں ان کا کلام ہے، ہندی ہے لیکن گجری ہندی ہے، اور حقیقت بھی یہی ہے۔ کلام کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی زبان پر گجرات کا اثر ہے، اور یہ قدرتی بات ہے، ہندی کہو یا اردو، یہ جہاں گئی مقامی رنگ کی جھلک اس میں ضرور آگئی۔"[2]

قدیم دکنی پر اور خاص اس زبان کی اس شاخ پر جو گجرات اور بیجاپور میں بولی جاتی تھی، گجراتی زبان کا اثر پڑا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ اسے بعض اوقات گجری کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے،[3] گجری سے مطلب اردو کی اس شاخ سے ہے جو

[1] ارشاد نامہ، ص ۱۳۱ [2] قدیم اردو، انجمن ترقی اردو، کراچی طبع اول ۱۹۶۱ء ص ۴۶

[3] ایضاً ص ۴۷

گجرات میں بولی جاتی تھی، اور جس میں مقامی گجراتی کے لفظ مل جل گئے تھے[1]،

اس طرح ڈاکٹر محی الدین قادری زور اور بابائے اردو کی تحقیق سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ گجری اردو کی ایک شاخ ہے، جس میں گجراتی زبان کے الفاظ کی آمیزش ہے۔ دونوں اس امر پر بھی متفق ہیں کہ بیجاپور کے شعرا، اپنی زبان کو "گجری" اس بنا پر کہتے ہیں کہ ان کے یہاں گجراتی زبان کے اثرات ملتے ہیں۔ البتہ ڈاکٹر زور صاحب اس کی تاویل زوال سلطنت گجرات اور گجری ادیبوں کی بیجاپور میں آمد سے کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اتنے گجری ادیب بیجاپور آگئے کہ مقامی لوگ بھی اپنی زبان کو گجری کہنے لگے۔ مولوی عبدالحق صاحب بغیر کسی خاص واقعہ کے حوالہ کے کہتے ہیں کہ گجری زبان کا رواج گجرات اور بیجاپور میں تھا، جہاں گجراتی زبان کے الفاظ اردو سے مل جل گئے تھے۔ انھوں نے اس کی کچھ مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ انکی بحث سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ بیجاپور کے علاوہ دوسرے دکنی علاقوں کے لوگ اپنی زبان کو "گجری" نہیں کہتے تھے، اس لیے اس کی چھان بین بھی ضروری ہے، کہ کتنے دکنی ادیبوں اور شاعروں نے اپنی زبان کو "گجری" کہا ہے؟ پروفیسر اکبرالدین صدیقی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ برہان الدین جانم کے والد میران جی شمس العشاق نے اپنی زبان کو کبھی گجری نہیں کہا ہے[2]، چونکہ گجرات کا زوال میران جی کے زمانہ میں نہیں بلکہ برہان الدین جانم کی عمر کے آخر میں یہ واقعہ پیش آیا، اس لیے ایک لحاظ سے ان کے گجری لکھنے کی اس تاویل کو تسلیم کیا جا سکتا تھا جو مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر زور نے پیش کی ہے، لیکن چونکہ ان کی تصنیف ارشادنامہ کا سال تصنیف ۹۹۰ھ ہے،

---

[1] قدیم اردو، انجمن ترقی اردو، کراچی طبع اول ۱۹۶۱ء ص ۷۰ [2] ارشادنامہ ص ۴۸

اور اس کے دو برس یا ۱۶ برس بعد ان کی وفات ہوئی، لہذا ڈاکٹر زور کے بیان کردہ واقعہ کا اثر ان پر پڑنا ناممکن ہے۔

اس بحث میں ایک ماہر دکنیات و گجریات کا نام لینا ضروری ہے، جس نے بمبئی میں اردو ادب کے چراغ کو برسوں روشن رکھا یعنی پروفیسر نجیب اشرف ندوی، انھوں نے اپنی مشہور کتاب "لغات گجری" کے مقدمہ میں اس زبان پر کافی روشنی ڈالی ہے، اور تفصیل سے بتایا ہے کہ گجرات اور دکن کے سیاسی حالات نے اردو کی عظمت کو بڑھایا، ان دونوں علاقوں کے حکمرانوں نے بدیسی چیزوں کے مقابلہ میں دیسی چیزوں کو اہمیت دینی شروع کی، اسی اصول کے تحت انھوں نے فارسی کے مقابلہ میں اردو کو اہمیت دی، اور دکن اور گجرات میں فرق صرف یہ ہے کہ گجرات میں اردو کو طویل عرصہ تک پروان چڑھنے کا موقع نہ ملا، اس کے مقابلہ میں دکن میں مختلف مسلم حکومتیں مدت دراز تک قائم رہیں، جن کی وجہ سے صدیوں تک اردو سرکاری سرپرستی میں ترقی و عظمت کی منزلیں طے کرتی رہی، وہ مزید لکھتے ہیں کہ گجرات میں جو ادبی اردو پروان چڑھی اس کے تین نام ملتے ہیں: (۱) گوجری (۲) گجری (۳) بول گجرات،

پروفیسر نجیب اشرف ندوی نے اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

"مجھے اردو کی ابتدا اور نشوونما میں گجرات کے کارناموں کو دیکھنے کا موقع ملا، اور ایک سال کی تلاش و جستجو اور غور و فکر کے بعد میں نے یہ کہنے کی جرأت کی کہ اردو کی ابتدائی ادبی تعمیر میں گجرات کو بڑی حد تک اولیت کا درجہ حاصل ہے، میں خوش ہوں کہ اردو کے محققین نے اس کو تسلیم کر لیا ہے"[1]،

---

[1] لغات گجری مرتبہ پروفیسر نجیب اشرف ندوی طبع اول بمبئی، ص ۵-۶

ابتک جو نظریات گجری زبان کے بارے میں پیش کیے گئے ان کا خلاصہ یہ کہ گجری اردو کی وہ شاخ ہے جس نے علاقہ گجرات میں نشو و نما پائی، اور گجری میں گجراتی زبان کے الفاظ شامل ہیں، مگر ان نظریات سے بالکل مختلف ایک نظریہ مشہور ماہر لسانیات ڈاکٹر سینتی کمار چیٹرجی کا ہے، ڈاکٹر گیان چند جین نے چیٹرجی کے نظریہ کی تشریح اس طرح کی ہے،

"اس کا گجرات سے کوئی تعلق نہیں، یہ نام گجران والا اور گجرات (پنجاب) کے دکن وارد سپاہیوں کا عطا کردہ ہے، چنانچہ دکنی شعراء شاہ برہان الدین جانم اور امین الدین دکنی نے اپنی زبان کو گجری کہا ہے۔[1]

سینتی کمار چیٹرجی کا نظریہ اس لیے قابل غور ہے کہ ضلع گجران والا کے سپاہی اتنی تعداد میں دکن میں نہیں آئے جس کی بنا پر زبان کا نام ہی بدل جائے، اسکی کوئی تاریخی شہادت نہیں ملتی، فوج میں دلی اور پنجاب کے سپاہی تھے، دراصل چیٹرجی کو یہ شبہ دکنی کے پنجابی پن سے ہوا، یہ وہی شبہ ہے جو اس سے قبل محمود خاں شیرانی کو بھی ہوا تھا، واقعہ یہ ہے کہ وہ تمام علامتیں جو دکنی کے پنجابی پن کو ظاہر کرتی ہیں، کھڑی بولی والے گروہ کی ساری زبانوں میں موجود ہیں، جن کو پروفیسر مسعود حسین خاں نے اپنی کتاب "مقدمہ تاریخ زبان اردو" کے آخری ابواب میں تفصیل سے پیش کیا ہے، پنجاب کے لوگ اردو بولیں یا ہندی مگر ان کی اصل زبان پنجابی رہی ہے اور وہ اپنے گھروں میں ہمیشہ استعمال کرتے ہیں، اس بنا پر یہ قیاس صحیح نہیں معلوم ہوتا،

گجری کے سلسلہ میں ایک بالکل نیا نظریہ پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی نے پیش کیا ہے، حال ہی میں انھوں نے ارشاد نامہ مصنفہ برہان الدین جانم کو مرتب کر کے

[1] اردوئے معلی لسانیات نمبر ص ۱۳۲

بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے، اس کے مقدمہ میں وہ اپنے نظریہ کی تشریح ان الفاظ میں کرتے ہیں :-

"دکن میں اکثر قصبات میں خواہ وہ حیدرآباد ریاست کے ہوں یا بیرونِ ریاست کے، شاہراہ پر کسی مخصوص جگہ روزانہ بھاجی، ترکاری یا دیگر ضروریات زندگی کی متعلقہ سامان کی عارضی دوکانیں لگتی ہیں اور بازار کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے چونکہ یہ دوکانیں مستقل نہیں ہوتیں اس لیے ان کا روبار دو تین گھنٹے سے زیادہ نہیں ہوتا اور چونکہ یہ دوکانیں گذرگاہ پر ہوتی ہیں، اس لیے ان کو گذری کہا جانے لگا اور کثرت استعمال سے گجری ہو گیا۔"

وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ان بازاروں کی زبان فصیح نہ ہوتی تھی، گاہکوں کی آسانی کیلئے دو تین زبانوں کے الفاظ ملا کر گفتگو کی جاتی تھی، برہان الدین جانم نے اپنی زبان کو گجری اسی لحاظ سے قرار دیا ہے، یعنی گذرگاہ کی آسان زبان جس کو ہر شخص سمجھ سکے"۔[1]

لفظ گجری تجارت کرنے کے معنی میں اردو میں استعمال ہوتا ہے، چنانچہ باغ و بہار میں خواجہ سگ پرست کے قصہ میں یہ لفظ اسی معنی میں میر امن نے استعمال کیا ہے، میں نے اس سلسلہ میں کچھ معلومات مشاہدات کی روشنی میں جمع کی ہیں، تحقیق سے معلوم ہوا کہ "گجری" کے نام سے آج بھی ہندوستان کے کئی شہروں میں بازار موجود ہیں، مثلاً بمبئی میں ایک بازار گجری کہلاتا ہے، کانپور میں بھی گذری بازار ہے، البتہ الہ آباد میں ایک بازار گدڑی بازار کہلاتا ہے، اس سے پروفیسر صدیقی کے نظریہ کی تائید ضرور ہوتی ہے، مگر یہ مسئلہ اردو کے ماہرین لسانیات کی توجہ کا مستحق ہے۔

[1] ارشاد نامہ ص ۴۲

دراصل صدیقی صاحب نے گجری کی اصل، تاریخ اور عام روایتوں سے صرف نظر کر کے لسانیات کے میدان میں تلاش کی ہے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر دکنی ادیبوں کے گجری لکھنے کی یہ تاویل تسلیم کر لی جائے، جیسا کہ بعض حقایق اس طرف اشارہ کرتے ہیں تو پھر یہ طے کرنا ہوگا کہ گجری کوئی زبان نہیں اور یہ دکنی ہی کا دوسرا نام ہے، یا پھر گجری کے دو مفہوم تسلیم کرنے پڑیں گے یعنی ایک، وہ زبان جو گجرات میں مسلم دور حکومت میں رائج تھی دوسری، دکنی جو گذری سے گجری بن گئی۔

یہاں یہ سوال بھی ذہن میں اٹھتا ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو اکثر دکنی ادباء و شعراء اپنی زبان کو "گجری" کہتے، صرف ادبائے بیجاپور ہی نے کیوں اپنی زبان کو گجری قرار دیا، یہی اعتراض سینتی کمار چٹرجی کے نظریہ پر بھی وارد ہوتا ہے۔

دراصل گجری زبان کے اتنے شواہد ہیں کہ اس کے وجود سے انکار ممکن نہیں خصوصاً خوب محمد چشتی ——— وغیرہ کی تخلیقات اس زبان کی اہمیت کو واضح کرتی ہیں، سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ دکنی شعراء اپنی زبان کو گجری کیوں لکھتے ہیں؟ اس سلسلہ میں جو نظریات اس مقالہ میں زیر بحث آئے ان کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

(۱) ڈاکٹر زور اور مولوی عبدالحق کا کہنا ہے کہ گجراتی زبان کے اثرات کی بنا پر ایسا ہے۔

(۲) چٹرجی کہتے ہیں کہ گجران والا ضلع پنجاب کے دکن جانے والے سپاہیوں کا دیا ہوا نام ہے۔

(۳) پروفیسر اکبر الدین صدیقی لکھتے ہیں کہ گجری دراصل گذری تھا، جو کثرت استعمال

سے گجری بن گیا، مگر وہ یہ نہیں بتاتے کہ بعض شعراء بول گجرات یا بولی گجرات لکھتے ہیں تو اس کی کیا تاویل ہو سکتی ہے؟[1] نیز یہ کہ دوسرے دکنی شعرا اپنے آپ کو گجری کیوں نہیں لکھتے۔ اس میں شبہہ نہیں کہ صدیقی صاحب کے دلائل کافی وزنی ہیں، اور لسانیاتی نقطۂ نظر سے ان کا نظریہ غور و فکر کا مستحق ہے۔

دراصل دکنی اور گجری کے علاقے اتنے متصل ہیں کہ ان میں فروق بہت کم ہیں اور راقم کا نظریہ ہے کہ زوال سلطنت گجرات ۱۵۷۲ء کے بعد جب شعراء و ادباء کثرت سے بیجاپور آگئے تو کچھ دن تک تو گجری کا نام باقی رہا اور بیجاپوری ادباء اس سے متاثر ہوئے، مگر بعد میں وہ دکنی میں ضم ہو گئی، اور اپنی انفرادیت کھو بیٹھی، اس بنا پر دکنی اور گجری میں اختلافات ایک خاص دور تک رہے، پھر بعد میں اردو کی وہ شاخ جو گجری کے نام سے گجرات میں پروان چڑھ رہی تھی، وہ دکنی میں ضم ہو گئی، اسی بنا پر ولی دکنی مشہور ہوئے، حالانکہ تمام تذکروں سے ان کا گجراتی ہونا ثابت ہے، سید ظہیر الدین مدنی نے اپنے رسالہ "ولی گجراتی" میں اس موضوع پر تذکروں سے ناقابل انکار شہادت پیش کی ہے، کہ ولی گجراتی تھے، نہ کہ دکنی یا اورنگ آبادی، مگر چونکہ ولی کے دور میں "گجری" دکنی میں ضم ہو چکی تھی، اس لیے وہ دکنی کے شاعر مشہور ہوئے نہ کہ گجری کے۔

---

[1] صدیقی صاحب ایک نجی خط میں اس کی تشریح یوں فرماتے ہیں کہ "بولی گجرات اور بول گجرات سے مراد گجراتی زبان یا گجراتی آمیز زبان ہو، اس کو گجری سے تعلق نہیں، گجراتی زبان نے کبھی شاہوں کی سرپرستی نہیں پائی، ایسا کوئی گلزار نہیں جس میں گجراتی بادشاہوں کی تعریف کی گئی ہو۔

وقت کی ناپ

اور

مساواتِ وقت

از جناب بدیعُ الزماں صاحب عظمی

تاریخ کی ابتدا کے قبل ہی انسان نے وقت کی ناپ کا تصور کر لیا تھا، اور سال مہینہ اور دن کی تقسیم کر لی تھی، اُس کی یہ کامیابی انسانی ارتقار کی ایک کڑی ہے، دن کا رات میں بدلتے رہنا، موسموں کی باقاعدہ تبدیلی، اور سورج، چاند، سیاروں اور ستاروں کا طلوع و غروب ان سب باتوں کے مشاہدہ ہی نے غالباً انسان کو وقت کی ناپ کا راز بتایا ہوگا،

آج سے ہزاروں سال قبل کے ہیئت دان رات رات بھر آسمان کو تکتے رہتے تھے، انھوں نے ستاروں کی رفتار اور چاند کے گھٹنے اور بڑھنے کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد قمری مہینوں کی تشکیل کر لی تھی، اگرچہ دنیا کے بیشتر ملکوں میں اسی نہج پہ کام ہوتا رہا، مگر وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ کونسا ملک اس سلسلے میں سب سے آگے تھا، گمان غالب ہے کہ اہلِ بابل نے آج سے چھ ہزار قبل سورج کے فلکی راستے کو بارہ برجوں میں بانٹ رکھا تھا، جو بارہ مہینوں سے منسوب تھے، انھوں نے قمری سال کو مہینوں اور دنوں میں، اور دنوں کو ساعتوں اور دقیقوں میں

تقسیم کر رکھا تھا، اُن کے نزدیک ۶۰ کا عدد، یا اُس کے اجزاے ضربی متبرک مانے جاتے تھے، پورا دن ۱۲ گھنٹے کا، اور ایک گھنٹہ ۳۶۰۰ سکنڈ کا ہوتا تھا، ان کا سال ۳۶۰ دنوں پر مشتمل ہوتا تھا، ہمارا موجودہ کلنڈر بھی انھی کا بنایا ہوا ہے، مگر تصحیح شدہ،

سال کو دنوں میں ترتیب دینا، اور دنوں کو گھنٹوں میں تقسیم کرنا دراصل وقت کی ناپ نہیں ہے ہیئت دانوں نے تو اپنے مشاہدات سے سال کی پوری ناپ کر لی تھی، مگر گھنٹوں اور منٹوں کو ناپنا کچھ آسان نہ تھا، انسان نے اس کا معقول حل تلاش کرنے میں ہزاروں سال گذار دیئے، یہ مسئلہ لاینحل ہی رہا ہوتا، اگر سترہویں صدی عیسوی میں ایک قابلِ اعتماد گھڑی کی ایجاد نہ ہوئی ہوتی،

اس سلسلے میں خلدانیوں نے جو کامیابی حاصل کی، وہ دھوپ گھڑیوں کی شکل میں تھی، ان گھڑیوں میں ایک بڑا عیب یہ تھا، کہ ابر آلود مطلع کے وقت یہ کام نہ دیتی تھیں، اور غروب آفتاب کے بعد تو اپنا کام ہی بند کر دیتی تھیں، دوسرا عیب یہ تھا کہ جس عرض البلد کے لئے یہ تیار کی جاتی تھیں، اسی مخصوص ارض البلد میں کام دیتی تھیں، وقت کی ناپ کا دوسرا طریقہ آبی گھڑیوں کی شکل میں تھا، یہ بھی عام طور پر مستعمل تھیں،

گھڑیوں کی ایجاد اور اُن کے استعمال نے پرانے طریقوں کو پس پشت ڈال دیا، کلاک کی ایجاد کا سہرا ایک جرمن مسمی ہنری ڈی وک (Henry de Vick) کے سر ہے، اس کی بنائی ہوئی کلاک ۱۳۷۹ھ میں منظرِ عام پر آگئی تھی ہے، ۱۹۵۷ء میں ایک ڈچ مسمی ہیوگنس (Huygens) نے ایک ایسی کلاک بنائی تھی، جس کے متعلق خیال ہے کہ وہ پنڈولم والی پہلی کلاک تھی، ہیوگنس کی تحقیق نے گھڑی سازی کے فن کا ایک نیا دور شروع کر دیا، نتیجہ سترہویں صدی کے اختتام تک کسی حد تک صحیح وقت دینے والی گھڑیاں بننے لگی تھیں آج تو دنیا

کی بڑی بڑی رصدگاہوں میں ایسی صحیح وقت دینے والی گھڑیاں موجود ہیں جن میں صرف ۱/۱۰۰۰ سکنڈ یومیہ کا فرق پڑنے کا امکان ہوتا ہے، ان رصدگاہوں میں اب تو خاص قسم کی دوربینوں کی مدد سے جنھیں (Photographic Zenith Tubes) کہتے ہیں، گھڑیوں کا وقت صحیح کیا جاتا ہے۔ اور وہاں سے بذریعہ ریڈیو نشر ہوتا رہتا ہے۔

صحیح وقت معلوم کرنے کے لئے ہمیں مساوات وقت (Equation of time) کا بھی سہارا لینا پڑتا ہے، کیونکہ دھوپ گھڑیوں کا وقت تو مقامی اصلی شمسی وقت (Local True Solar Time) کہلاتا ہے، مقامی وقت اس لئے کہ دھوپ گھڑیاں جہاں نصب ہوتی ہیں، وہ وہیں کے وقت کو بتاتی ہیں، اس لئے کہ ان کا تعلق براہِ راست سورج کی روشنی سے ہوتا ہے، دھوپ گھڑیوں والا وقت آج کی دنیا میں ہماری روزمرہ کی زندگی کے لئے قابلِ عمل نہیں ہوتا، کیونکہ نہ تو سال بھر دن ہی یکساں ہوتے ہیں، اور نہ ایک دوپہر سے دوسری دوپہر تک کا وقفہ ہی یکساں ہوتا ہے، اس لئے صحیح وقت جاننے کے لئے سورج کے مقابلہ میں ستاروں کا سہارا لینا زیادہ مناسب ہے۔

ماہرینِ ہیئت زمین کی محوری گردش اور ستاروں کے محلِ وقوع ہی سے دن کی لمبائی ناپتے ہیں، کوکبی دن (Sidereal Day) لمبائی کے لحاظ سے شمسی دن (Solar Day) کے مقابلہ میں کسی قدر چھوٹا ہوتا ہے، اسے یوں سمجھئے کہ اگر سورج اور کوئی ستارہ ایک سیدھ میں سمت الراس پر ہوں تو زمین کی ایک پوری محوری گردش کے بعد وہی ستارہ پھر سمت الراس پر آجائے گا، مگر اسی اثناء میں چونکہ

سورج ذرا مشرق کی سمت کھسک چکا ہوگا، اس لئے سورج کو سمت الراس پر آنے میں تقریباً ۳ منٹ ۵۶ سکنڈ اور لگ جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ کوکبی دن شمسی دن کے مقابلہ میں ۳ منٹ ۵۶ سکنڈ چھوٹا ہوتا ہے، ہم جانتے ہیں کہ شمسی دنوں کے لحاظ سے پورا سال ۳۶۵ ۱/۴ دنوں کا ہوتا ہے، مگر ایک سال میں ۳۶۶ ۱/۴ کوکبی دن ہوتے ہیں۔

اس لئے ماہرینِ ہیئت ایک ایسے فرضی سورج کا وجود تسلیم کرتے ہیں، جس کا مدار نہ صرف گول ہے، بلکہ زمین کے مدار پر زاویہ قائمہ بھی بناتا ہے، اسی فرضی سورج سے حاصل کردہ دنوں کو اوسط شمسی دن (Mean Solar Day) کہتے ہیں جو نہ صرف سال بھر یکساں ہوتے ہیں، بلکہ اصلی شمسی دنوں (True Solar Day) کے اوسط کے برابر ہوتے ہیں، زمین اپنے محور پر ۲۳ گھنٹہ اور ۵۶ منٹ میں ایک گردش کرتی ہے، مگر ایک دوپہر سے دوسری دوپہر تک کا وقفہ ۲۴ گھنٹہ مانا جاتا ہے، چونکہ اسی اصول پر گھڑیاں بنائی جاتی ہیں، اور وہ یہی وقت دیتی بھی ہیں، اس لئے چار منٹ یا صحیح طور پر ۳ منٹ ۵۵.۹۱ سکنڈ کی اوسط رعایت گھڑیوں کے وقت میں کرنی پڑتی ہے، اس کے علاوہ مدارِ ارضی بیضوی ہونے کی وجہ سے سورج کے سالانہ طواف میں ہماری زمین کبھی سورج کے قریب آجاتی ہے، اور کبھی دور ہو جاتی ہے، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی محوری گردش کبھی تیز ہو جاتی ہے، اور کبھی سست، اس لئے شمسی دنوں میں یکسانیت نہیں رہ جاتی، شروع جنوری میں جب کرۂ ارض مدارِ ارضی کے مقام حضیض (Perihelion) پر ہوتا ہے، تو سورج سے کسی قدر قربت کی وجہ سے اس کی گردش تیز تر ہو جاتی ہے، اس لئے ان ایام میں گھڑیوں کا رعایتی وقت کچھ اور نا کافی ہو جاتا ہے، جیسا کہ نیچے دی ہوئی شکل سے ظاہر ہوتا ہے:۔

Aphelion
مقام اوج
سورج
Prihelion
(مقام حضیض)
مدار ارضی
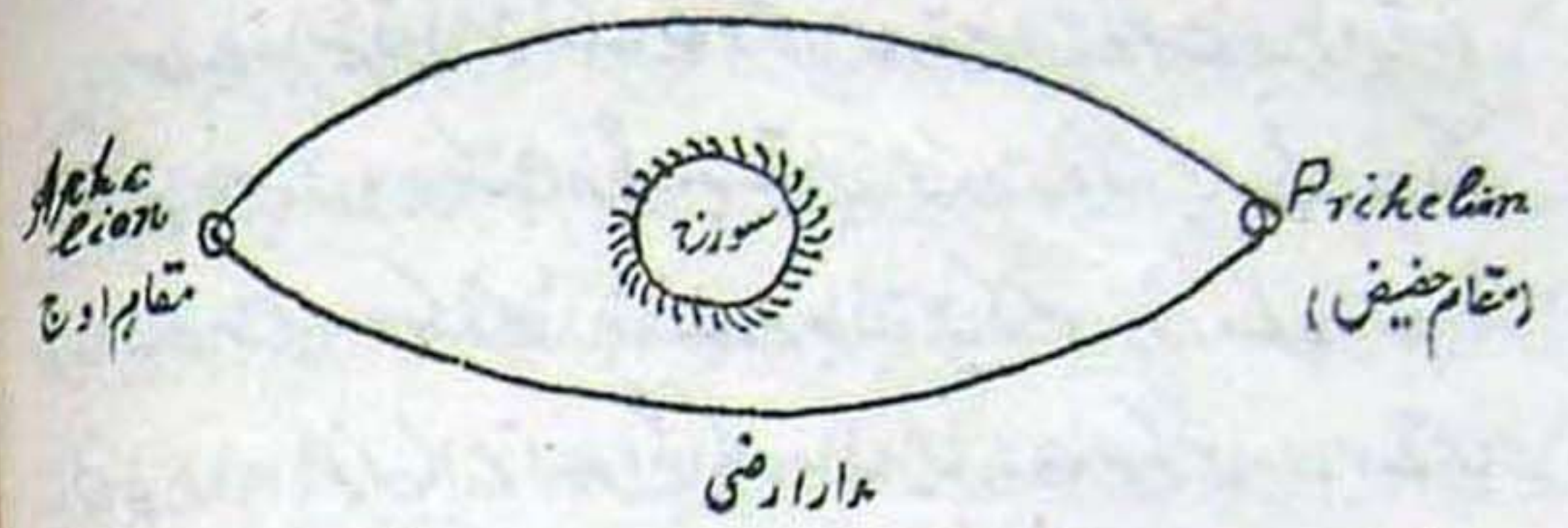
گھڑیاں تو ہمیں اوسط شمسی وقت اور دھوپ گھڑیاں ظاہری شمسی وقت بتاتی ہیں، ان دونوں کے اوقات کے فرق کو "مساوات وقت" کہتے ہیں، خاص خاص جنتریوں اور کیلنڈروں میں تاریخ وار یہ فرق درج رہتا ہے، جس کی مدد سے ہم طلوع و غروب آفتاب وغیرہ کے اوقات کو آسانی کے ساتھ معلوم کر سکتے ہیں، چونکہ دھوپ گھڑیاں دوران سال میں کبھی سست چلتی ہیں، اور کبھی تیز، اس لئے ان کا وقت ان گھڑیوں کے مقابلہ میں کبھی آگے رہتا ہے اور کبھی پیچھے، ان دونوں کے اوقات میں سب سے زیادہ فرق ۱۶ منٹ اور ۲۰ سکنڈ کا ہوتا ہے، جو نومبر اور فروری کے مہینوں کی وسطی تاریخوں میں رہتا ہے،

نومبر کی وسطی تاریخوں میں جب دھوپ گھڑیاں نصف النہار کا وقت دیتی ہیں، تو ہماری گھڑیوں میں ۱۱ بجکر ۴۳ منٹ اور ۴۲ سکنڈ ہوتے ہیں، اور فروری کی وسطی تاریخوں میں جب نصف النہار ہوتا ہے تو ہماری گھڑیوں میں ۱۲ بجکر ۱۶ منٹ اور ۲۰ سکنڈ ہو جاتے ہیں، گویا ماہ فروری میں سورج کو سمت الراس پر آنے میں یا نصف النہار ہونے میں گھڑی کے وقت کے اعتبار سے تاخیر ہونے لگتی ہے، یہی وجہ ہے کہ موسم سرما کے چھوٹے دنوں کے بعد جب دن بڑھنے لگتا ہے، تو دوپہر کے بعد کا وقت تیزی کے ساتھ بڑھتا ہے، جس کی وجہ سے نومبر کے مقابلہ میں فروری کے مہینہ میں غروب آفتاب دیر میں ہونے لگتا ہے، یعنی طلوع آفتاب سے ۱۲ بجے تک کے وقفہ کے مقابلہ میں بارہ بجے سے غروب آفتاب تک کا وقفہ بڑھ جاتا ہے،

ماہرین ہیئت کو کبھی اوقات ہی سے گھڑیوں کا وقت ٹھیک کرتے رہتے ہیں، مگر کوکبی اوقات ہمارے لئے قابل قبول نہیں ہوتے، کیونکہ کوکبی نصف النہار دوران سال میں دن اور رات کے مختلف اوقات میں پڑا کرتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر آج کوئی ستارہ ٹھیک بارہ بجے دن میں سمت الراس پر آئے تو ۴ منٹ یومیہ کے حساب سے پندرہ دن بعد وہی ستارہ گیارہ بجے سمت الراس پر آجائے گا، اور ایک مہینہ بعد دو گھنٹہ کا فرق پڑ جائے گا، چھ مہینہ بعد بارہ گھنٹہ کا فرق پڑ جائے گا، یعنی وہی ستارہ آدھی رات کو سمت الراس پر آجائے گا، علیٰ ہذا القیاس، اس لئے ہم کوکبی وقت کو ہیئت دانوں ہی کے لئے چھوڑتے ہیں، ہمارے لئے تو اوسط شمسی وقت (Mean Solar Time) یا دوسرے الفاظ میں گھڑیوں کا وقت ہی مناسب ہے کیونکہ ہماری عملی زندگی تو سورج کے طلوع و غروب سے ہی وابستہ ہے،

مقالہ نما

مضامین الندوہ

از

مولوی سلمان شمسی صاحب ندوی

(۵)

خلیفہ منصور اور اس کے قاضی — ذی الحجہ ۱۳۲۲ء

ص - ۲۸ - ۳۲

حوالہ ۲۷۹/۱

ماخوذ از تاریخ الخلفاء، امام جلال الدین سیوطی،

عبدالسلام ندوی — دسمبر ۱۹۰۶ء

۱- امام مسلم۔

ص - ۱۳ - ۳۲

حوالہ - ۲۷۹/۳

امام صاحب کی تنقید اور حقیقت شناسی کا اس قدر شہرہ تھا کہ ابوزرعہ اور ابوحاتم جیسے ادا شناس بزرگ ان کو معرفتِ حدیث میں اس زمانہ کے تمام مشائخ پر ترجیح دیتے تھے، اسحٰق کوسج خود امام صاحب سے خطاب کرکے فرماتے تھے،

۲- شیخ شہاب الدین سہروردی — جولائی ۱۹۰۶ء،

ص - ۱ - ۳۰ حوالہ ۲۷۹/۳

شیخ الاشراق نے جس طرح فلسفۂ ارسطو کے عام مسائل پر طرز استدلال پر مقدمات پر خردہ گیریاں اور نکتہ چینیاں کی ہیں، اسی طرح اپنے خاص مسائل کو ایسے جدید پیرایہ میں بیان کیا ہے کہ فلسفۂ ارسطو کی مطلق آمیزش نہیں پائی جاتی، اور در حقیقت یہی خصوصیت اُن کے فلسفہ کو علم کلام اور فلسفۂ ارسطو دونوں سے ممتاز کرتی ہے"

عبدالحیٔ حسنی حکیم

ندوہ کا مشرقی مطالع — اپریل ۱۹۴۰ء

(تذکرہ فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی) — ص - ۱۵ - ۲۱

حوالہ ۲۸۷

حضرت مراد آبادی سے ایک ملاقات کے تاثرات)

عبدالرحمٰن ندوی نگرامی — جون ۱۹۱۶ء و جولائی ۱۹۱۶ء

۱- ابوتمام — ص ۲۵

(عرب کا مشہور شاعر) — حوالہ ۲۸۶

۱۹۲ھ میں پیدا ہوا اور ۲۳۱ھ میں انتقال کیا، عام ابتدائی حالات سے مورخین نے زیادہ بحث نہیں کی ہے، نسب کے لحاظ سے طائی ہے، شاعری میں خاص کمال پیدا کیا؛

۲- اسماعیل بن عباد — مئی ۱۹۱۶ء

ص - ۲۶ - ۳۲

حوالہ ۲۸۶

سلطنتوں میں آل بویہ خاندان کو بھی علوم و فنون کی سرپرستی میں ایک خاص مقام حاصل ہے، ہم ذیل میں اسی خاندان کے فاضل رکنِ سلطنت اسماعیل بن عباد کا تذکرہ

کرتے ہیں جس سے اندازہ ہوگا کہ دولت اور علم کیونکر ہمارے اسلاف کی گود میں ہم آغوش ہوکر پرورش پاتے تھے،"

۳۔ قاضی ابو یوسف ‏ فروری سنہ ۱۹۱۶ء

ص ۲۲ - ۳۲

حوالہ ۲۸۷

علامہ ابن ندیم نے کتاب الفہرست میں قاضی صاحب کے جن مصنفات کا تذکرہ کیا ہے، ان میں بعض تو اس قسم کے ہیں، کہ چند ابواب فقیہ لئے ہوئے ہیں، اور انہی میں سے ایک ایک باب پر مستقل تصانیف ہیں، مثلاً کتاب الصلوٰۃ، کتاب الزکوٰۃ، کتاب الصوم، ان کے علاوہ مستقل تصانیف یہ ہیں، کتاب اختلاف الامصار" کتاب الرد علی مالک بن انس کتاب الخراج وغیرہ،

مولانا عبد الماجد دریابادی ‏ اگست سنہ ۱۹۴۰ء

عہد قریب کا ایک گمنام عالم ‏ ص ۔ ۴ ۔ ۱۴

"مولانا منظر کریم دریابادی" ‏ حوالہ ۲۸۰/۲

"پچھلی صدی میں صوبہ اودھ کی خاک سے متعدد علماء ایسے اٹھے کہ اپنے معاصرین میں ممتاز سمجھے گئے، لیکن دیکھتے ہی دیکھتے گمنام ہوگئے، کوئی یادگار اپنی ایسی نہ چھوڑی کہ نام عرصۂ دراز تک چلتا۔ انہی گمنام مشاہیر میں ایک مولانا منظر کریم صاحب دریابادی تھے،"

علوی ضیاء الحسن ‏ اگست سنہ ۱۹۰۸ء

۱۔ ابن خلکان اور یورپ" ‏ ص ۔ ۱۳ ۔ ۲۷ ۔ حوالہ ۲۷۹/۵

مستشرق موسیو میک گلگن ڈی سلین فرانسیسی کے دیباچہ ابن خلکان کا اردو ترجمہ جس میں اس کی شخصیت اور کتاب پر روشنی ڈالی گئی ہے،"

۲۔ مولوی غلام علی آزاد بلگرامی ‏ ص صفر سنہ ۱۳۲۳ھ

ص ۔ ۱۳ ۔ ۲۷

حوالہ ۲۷۹/۵

اُن کی تصنیفات ہندوستان میں اپنی قسم کی پہلی تصنیف ہیں، فن رجال اور تاریخ اگرچہ مسلمانوں کا گویا خاص فن ہے لیکن ہندوستان کی علمی حالت کی کچھ ایسی افتاد پڑی تھی کہ ابتدا سے اس زمانہ تک ہزاروں علماء و فضلاء کے حالات پر گمنامی کا پردہ پڑا ہے، آزاد سب سے پہلے شخص ہیں جنھوں نے ہندوستان کے علماء اور ارباب عمائم کے حالات قلمبند کئے، آزاد نے اس اولیت پر فخر کا اظہار کیا ہے، اور بجا کیا ہے،

۳۔ ابن خلدون ‏ جون سنہ ۱۹۰۸ء و جولائی سنہ ۱۹۰۸ء

حوالہ ۲۷۹/۵

آٹھویں صدی میں علامہ ابن خلدون کا دور تھا، جو نہ صرف اس صدی بلکہ تمام عہد اسلام کے شہرۂ آفاق مورخ تھے، اور جن کا نام موضوع کلام کا عنوان ہے، انھوں نے اپنی تاریخ کی آخری جلد میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ اپنے واقعات لکھے ہیں،

۴۔ ابو موسیٰ جابر بن حیان طرطوسی ‏ محرم سنہ ۱۳۲۴ھ

ص ۔ ۹ ۔ ۱۹

حوالہ ۲۷۹/۲

مذکورۂ بالا شخصیت کا تفصیلی تعارف، اس کی ایجادات و انکشافات کا تذکرہ، تصانیف

کی تعداد اور اُن کا سرسری جائزہ اور علمی خصوصیات پر فاضلانہ تبصرہ۔"

۵۔ ذوالنون مصری　　جمادی الاولیٰ ۱۳۲۳ھ

ص - ۱ - ۱۰

حوالہ ۲۷۹/۲

مسلمانوں میں ذوالنون کی غیر معمولی شہرت ہے، اُن کا نام ادب سے لیا جاتا ہے، اُن کی کرامتیں نہایت دلچسپی سے بیان کی جاتی ہیں، باایں ہمہ شہرت یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہو گا کہ ذوالنون کیمیا میں بھی صاحبِ فن تھے، اور مرکبات کے تجزیہ و تحلیل اور مفردات کی ترکیب و تالیف میں اُن کو خاص دستگاہ تھی۔"

۶۔ شیخ محمد عبدہٗ　　جمادی الآخر ۱۳۲۳ھ

ص - ۲۵ - ۳۲

حوالہ ۲۷۹/۲

تاریخ، تفسیر، ادب، اور علم توحید میں ان کی کتابیں یادگار رہیں، جن میں کتاب التوحید، تفسیر سورۂ فاتحہ، تفسیر سورۂ عصر، تفسیر عما یتساءلون، حواشی بصائر نصیریہ، شرح نہج البلاغہ، شرح مقامات بدیع الزماں شائع ہو چکی ہیں، صاحب موصوف ۱۳۱۷ء میں مصر کے مفتی اعظم ہوئے،

"شخصیت اور اُن کی دعوت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔"

مشوق حسین، ایم۔ اے،　　اپریل ۱۹۰۷ء

باباطاہر ہمدانی

ص - ۲۶ - ۳۱ - حوالہ ۲۷۹/۴

حوالہ ۲۷۹/۴

طاہر عریاں ہمدانی اُن کا نام بابا طاہر تھا، اپنے زمانہ کے صوفیائے کرام میں سے تھے بعض مصنفین کا بیان ہے کہ یہ سلاطین سلجوقیہ کے زمانہ میں تھے، مگر یہ غلط ہے، یہ دیلمیوں کے زمانہ میں گذرے ہیں، قدمائے شیوخ میں اُن کا بھی شمار ہے، اُن کا زمانہ ۴۱۰ھ ہے، اور عنصری و فردوسی اپنے تمام معاصرین سے پہلے ہی انتقال فرمایا، اُن کی رُباعیاں آج تک مقبول ہیں۔"

"اخلاقیات و سماجیات"

سلیمان ندوی۔ سید علامہ　　جنوری ۱۹۰۸ء

"علمائے سلف میں استغنا"　　ص - ۱۷ - ۲۷

حوالہ ۲۷۹/۴

ہمارا خیال ہے کہ استغنا تمام اخلاق کی جان ہے، تکمیل اخلاق نہیں ہو سکتی جب تک انسان کا دل دنیا اور اس کی دولت سے غنی نہ ہو، اور اس کی آنکھوں میں دنیاوی زخارف کی کچھ عزت نہ ہو، فن اخلاق کے جلی عنوان یہ ہیں، راست بازی، آزادی رائے، صبر و شکر، علوئے ہمت، استقلال، صدق، خودداری، عزت نفس، ان میں سے کوئی چیز ایسی نہیں جو استغنا کے بغیر حاصل ہو سکتی ہے،

شبلی نعمانی علامہ　　جمادی الاولیٰ

۱۳۲۲ء

"اخلاق عرب"　　ص - ۲۰ - ۲۴

حوالہ ۲۷۹/۱

"جدید تعلیم میں ابتداء سے آخر تک اس بات کا موقع ہی نہیں ملتا کہ اسلاف کے کارناموں سے واقفیت حاصل کی جائے، اس لئے جب فضائل انسانی کا ذکر آتا ہے، تو خواہ مخواہ انہی لوگوں کی زبان پر آتا ہے جن کے واقعات کی آوازیں کانوں میں گونج رہی ہیں"

عربوں کے بعض اخلاقی واقعات کا تذکرہ،

شروانی حبیب الرحمن خاں — شعبان ۱۳۲۲ھ

"اخلاق" ص - ۱ - ۸

حوالہ ۲۷۹/۱

اسلام نے اخلاق کو اپنی تعلیم میں کیا مرتبہ دیا، پاکیزہ اخلاق کو حاصل کرنے اور برے اخلاق سے بچنے کی کس درجہ تاکید کی، تعلیم اسلام میں اخلاق حسنہ کیا ہیں، اور برے اخلاق کیا، ان امور کو احادیث نبویہ کی رو سے بیان کرنا مقصود ہے،

عبدالسلام قدوائی ندوی — فروری ۱۹۴۲ء

فقر کی شان استغنا" ص - ۱۸ - ۲۰ حوالہ ۲۸۰/۲

اخبار الاخیار سے بعض بزرگوں کے شان استغنا کے واقعات ترجمہ کئے گئے ہیں،

عبدالسمیع، ایم - اے، — اپریل ۱۹۴۰ء تا اگست ۱۹۴۰ء

بچہ اور تعلیم — حوالہ ۲۸۷

"مختلف اقوام نے بچہ کی تعلیم وتربیت پر کس طرح توجہ کی، آئندہ صفحات پر ان کی کوششوں کا تذکرہ ہوگا، ازمنہ ماضی کے تاریخی اوراق پیش نظر رکھ کر دیکھا جائے گا کہ قدیم نظریات کیا تھے، اور اب ماہرین علم النفس نے جو جدید نظریات پیش کئے ہیں، وہ کیا ہیں، اور کن اصولوں کے ماتحت بچہ کی تعلیم وتربیت کے موثرات کا جائزہ لیا جاتا ہے،

عبدالماجد دریابادی (مولانا) — جون ۱۹۱۱ء

حکمائے یورپ کے اقوال۔ ص - ۲۵ - ۳۰ حوالہ ۲۷۹/۸

حکمائے یورپ کے اقوال مختلف موضوعات پر پیش کئے گئے ہیں،

عزالدین ندوی، — اکتوبر ۱۹۴۱ء

"معاشی توازن کے نئے تخیل، ص - ۲۱ - ۳۰

حوالہ ۲۸۰/۲

میں چاہتا ہوں تمام نو زائیدہ نظام آپ کے سامنے آئیں، پھر اشتراکیت نظام کو نمایاں کرکے اسلام کے اقتصادی اور فطری نظام کو پیش کروں تاکہ دنیا کو یہ معلوم ہوجائے کہ اسلام انسانی ہمدردی اور معاشی نظام کی کتنی اعلیٰ دلکش اور صحیح تصویر پیش کرتا ہے،

عام نظریات اور اسلامی نظریہ کا جائزہ،

علوی، ضیاء الحسن — رمضان ۱۳۲۲ھ

عمر اور صحت کی تدابیر، ص - ۳۰ - ۳۳

حوالہ ۲۷۹/۱

اب اس میں کوئی شک نہیں رہا کہ تدابیر صحت سے عمر میں ترقی ہوتی ہے، لیکن ثبوت ان ممالک میں علم الاعداد کی رو سے کچھ آسان نہیں، کیونکہ آبادی و ولادت اور اموات کا شمار یہاں رائج ہوئے بہت کم عرصہ گذرا ہے، بخلاف یورپ اور انگلستان کے جہاں یہ طریقہ مدت سے رائج ہے،

ہادی شاہ محمد ہادی — شعبان ۱۳۴۰ء

"اخلاق کا مقصد قومی تعمیر ہیں! ص ۱۴ - ۲۲ حوالہ ۲۸۷

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اصلاحی پکار ایک بجلی کا کڑکا تھا، یا ایک صوتِ ہادی تھی؛ جس نے عرب کی ساری زمین ہلا دی، اور سارے عرب میں اصلاح کا شور مچ گیا، ایک زمانہ کے بگڑے ہوئے بنے، اور بہت دن کے سوئے ہوئے جاگے، اور آن کی آن میں ساری دنیا پر چھاگئے۔"

مندرجہ ذیل موضوعات پر روشنی ڈالی گئی ہے؛

قرآن مجید کا اخلاق پر اثر۔ آنحضرتؐ کی تعلیمات کا اخلاق پر اثر، صحابۂ کرام اخلاقی حیثیت سے اسلامی قوت کا انحطاط۔ یورپ کا عروج، یورپ کا اخلاقی انحطاط،

مباحث منطق، حکمت و فلسفہ

سلیمان ندوی، (سید علامہ) جنوری ۱۹۱۲ء

"فنائے مادہ" ص - ۱۵ - ۲۶

حوالہ - ۲۷۹/۹

سائنس اور مذہب کے متنازع فیہ مسائل میں ایک مسئلہ فنا و بقار کے مادہ کا مسئلہ ہے، یہ مسئلہ بذات خود کوئی متنازع فیہ مسئلہ نہیں ہے لیکن چونکہ اس کے ثبوت و عدم ثبوت کا لازمی نتیجہ حدوث و قدیم عالم ہے اس لئے اس مسئلہ کی سرحد پر آکر خواہ مخواہ سائنس اور مذہب کا حریفانہ مقابلہ ہو جاتا ہے،

"قوت باصرہ اور نور" اکتوبر ۱۹۰۶ء

ص - ۱۳ - ۲۳

حوالہ - ۲۷۹/۳

"مسلمانوں نے ان دونوں شاخوں پر کثرت سے بحثیں کی ہیں، فلسفہ اشراق کی عمارت

کا سنگ بنیاد یہی نور ہے، گو اس علم نے بھی یونانی لباس میں رہ کر عربی لباس پہنا ہے، اگر مسلمانوں کی علمی کوششوں نے اس فن کی حیثیت ایسی بدل دی ہے، کہ وہ خود اس کے موجد کہے جا سکتے ہیں"

"مادہ کے اجزائے ترکیبی" فروری ۱۹۰۸ء

ص - ۱۷ - ۲۹

حوالہ ۲۷۹/۵

"کیمیائی تحقیق کا جب اور قدم آگے بڑھا، تو خود ان عناصر کی بساطت، حقیقت اور خواص پر بحث ہونے لگی، ابتداءً علمائے کیمیا کا خیال تھا، کہ عناصر کی حقیقت جداگانہ ہے مگر دقت نظر نے یہ ظاہر کیا کہ یہ عناصر خود ایک نہایت ہی لطیف عنصر سے مرکب ہیں، اور یہی لطیف عنصر کل عناصر کی حقیقت ہے، اور یہی ایک چیز تمام کائنات کی اصل ہے۔"

(باقی)

ادبیات

غزل

جناب ڈاکٹر ولی الحق انصاری،

اے دوست مسرت کے پہلو میں الم بھی ہیں — رقصاں ہے خوشی جن میں آنکھیں وہی نم بھی ہیں

ہے نام خدا لب پہ اور دل میں صنم بھی ہیں — اک طرفہ بشر یارو اس دور میں ہم بھی ہیں

کچھ ایسے بھی بت ہیں گھر جن کا ہے صنم خانہ — رہتے ہیں دلوں میں جو کچھ ایسے صنم بھی ہیں

دنیا کو مٹاتے ہیں کچھ ہوش و خرد والے — تخریب کے میداں میں کچھ اہلِ قلم بھی ہیں

ایام گذشتہ کی پُرکیف حسیں یادیں — سرمایۂ شادی بھی ہیں مایۂ غم بھی ہیں

اغیار ستم پیشہ کے جور کا شکوہ کیا — مٹنے کا میرے باعث اپنوں کے کرم بھی ہیں

اک وہ بھی زمانہ تھا جب لطف کی بارش تھی — اب وقت وہ ہے جب ہم محرومِ ستم بھی ہیں

اے چشم حقیقت بیں ہشیار کہ دنیا میں — گلزار بداماں بھی اور باغ ارم بھی ہیں

جب ایک سی حالت سب کی بزم ہستی میں — گرداب میں گر تم ہو منجدھار میں ہم بھی ہیں

اوضاعِ زمانہ کو سمجھا ہے ولیؔ ہم نے — ہیں محرم شادی بھی اور خوگر غم بھی ہیں

غزل

از جناب ماہر القادری

نگاہِ دوست کی موجِ تشنگی کیا ہے — وہ آگئے تو ضرورت شراب کی کیا ہے،

ادھر سے بندہ نوازی کی کوئی حد نہ رہی — میں سوچتا ہی رہا فرضِ بندگی کیا ہے

سفر کا لطف تو جب ہے ٹھہر ٹھہر کے چلو — یہ راہِ شوق ہے ایسی روا روی کیا ہے

نیاز مندوں سے وحشت ہے ربط غیروں سے — حضور! آپ کا معیارِ دوستی کیا ہے

خیال و فکر کے سب جھلملا رہے ہیں چراغ — ہجوم ہے یہ اندھیروں کا روشنی کیا ہے

بڑے بڑوں کی نہیں اُس جگہ پذیرائی — ہم ایسے خاک نشینوں کا ذکر ہی کیا ہے

نہ حُسن ہی کو خبر ہے نہ عشق کو معلوم
وصال و ہجر میں یہ ربط باہمی کیا ہے

غزل

از

جناب چندرکاش بجنوری

محبت اپنا خود آئین بھی ہے — یہی ایمان بھی ہے دین بھی ہے

تڑپنے کا سلیقہ ہو تو ناداں — تڑپنے میں بڑی تسکین بھی ہے

محبت ہے بظاہر جتنی سادہ — مزاجاً اتنی ہی رنگین بھی ہے

پرِ پرواز اور فکرِ اسیری — پرِ پرواز کی توہین بھی ہے

نہ راس آئے اگر غم اہلِ دل کو — تو پھر یہ حادثہ سنگین بھی ہے

کئی دن سے عجب عالم ہے جوہرؔ
طبیعت شاد بھی غمگین بھی ہے

مطبوعاتِ جدیدہ

احکامِ شرعیہ میں حالات و زمانہ کی رعایت

مرتبہ مولانا محمد تقی امینی صاحب ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی،
صفحات ۳۲۸، مجلد مع گرد پوش، قیمت لعہ، ناشر ندوۃ المصنفین، جامع مسجد، دہلی ۶۔

شریعت کے احکام و مسائل میں زمانہ کے حالات کی رعایت ضروری ہے، اور ہر زمانہ کے فقہا نے اس کا لحاظ رکھا ہے، مولانا محمد تقی امینی نے جو فقہ و اجتہاد کے مختلف پہلوؤں پر مفید کتابیں اور محققانہ مضامین لکھ چکے ہیں، زیر نظر کتاب میں اس مسئلہ پر مفصل اور مبسوط بحث کی ہے، یہ کتاب ایک مقدمہ اور تین ابواب پر مشتمل ہے، پہلے باب میں قرآن مجید سے، دوسرے میں حدیث نبوی سے اور تیسرے میں صحابۂ کرام (شیخین) کے تعامل سے احکام شرعیہ میں حالات و زمانہ کی رعایت کے دلائل فراہم کیے ہیں، حضرت عمرؓ کے عہد میں فتوحات کی وسعت نے بہت سے نئے مسائل پیدا کر دیے تھے، جن کو انھوں نے اپنے اجتہاد سے حل کیا، مولانا شبلی نے الفاروق میں اسکو تفصیل سے لکھا ہے، اس کتاب میں بھی ان کو پیش کیا گیا ہے، لیکن شریعت کے منصوص اور قطعی الثبوت احکام میں کوئی تبدیلی نہیں کیجا سکتی، اور نہ حالات و زمانہ کی رعایت سے احکام کا موقع و محل متعین کرنے کی اجازت و ضرورت بالکل عام اور مطلق ہے، جس کی وضاحت مولانا امینی اپنی دوسری کتاب "مسئلۂ اجتہاد پر تحقیقی نظر" میں کر چکے ہیں،

اس کتاب میں بھی اس کا ذکر آ جانا چاہیے تھا، ورنہ اس کے بعض مباحث سے غلط فہمی پیدا ہونے کا اندیشہ ہے، فقہاء کے مسالک کے سلسلہ میں ان کے مذاہب کی مشہور اور معتبر کتابوں کا حوالہ دینے کی ضرورت تھی، مگر صفحہ ۶۷ پر امام ابو حنیفہؒ کی جانب منسوب ایک خاص مسئلہ میں یہ احتیاط ملحوظ نہیں رکھی گئی ہے، اس قسم کی بعض معمولی باتوں سے قطع نظر فاضل مصنف کی دوسری کتابوں کی طرح یہ کتاب بھی عالمانہ، مدلل اور لائق مطالعہ ہے۔

تذکرہ نکات الشعراء

مرتبہ ڈاکٹر محمود الٰہی صاحب تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۱۶۴ مجلد مع گرد پوش، قیمت مخر، پتہ: ادارۂ تصنیف ڈی ۷، ماڈل ٹاؤن، دہلی ۹

اردو شعراء کے قدیم تذکروں میں نکات الشعراء کو اس کی قدامت اور میر جیسے عظیم شاعر کی نسبت کی وجہ سے بڑی اہمیت اور مقبولیت حاصل ہوئی، انجمن ترقی اردو ہند نے پہلے مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم کے مقدمہ اور دوبارہ بابائے اردو مولوی عبد الحق مرحوم کے مقدمہ و حواشی کے ساتھ اس کو ... شائع کیا تھا، مگر اب یہ دونوں اڈیشن کمیاب ہیں، اس لیے گورکھپور یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے لائق صدر ڈاکٹر محمود الٰہی نے اس کو مزید اہتمام سے شائع کیا ہے، انھوں نے اسکی تصحیح و ترتیب میں مطبوعہ اڈیشنوں کے علاوہ پیرس کے ایک مخطوطہ اور بعض دوسرے مخطوطات سے بھی مدد لی ہے، اور نسخوں کے فرق و اختلاف کو ظاہر کرنے کے لیے متن میں علامتیں اور حاشیے میں وضاحتیں کر دی ہیں، اس طرح یہ اڈیشن نسبۃً زیادہ جامع ہو گیا ہے، شروع میں فاضل مرتب کے قلم سے ایک مقدمہ بھی ہے، اس کے شروع میں تذکرہ کے سبب تصنیف، اہمیت و خصوصیت اور قریب قریب اسی زمانے میں لکھے جانے والے

ایک دوسرے تذکرہ ریختہ گویاں سے اس کا یک گونہ تقابل اور آخر میں دونوں مطبوعہ ایڈیشنوں اور قلمی مخطوطات کی نوعیت و کیفیت اور زیر نظر نسخہ کی ترتیب وغیرہ کے متعلق معلومات تحریر کیے ہیں، اس مفید ادبی و تحقیقی خدمت کے لیے لائق مرتب اردو شعر و ادب کے شائقین کے شکریے کے مستحق ہیں،

اردو کے اہم رسالے اور اخبار - مرتبہ جناب عابد رضا بیدار صاحب، تقطیع خورد کاغذ اچھا، کتابت و طباعت غنیمت، صفحات ۱۹۱ مجلد مع گرد پوش، قیمت عہ/
پتہ رامپور انسٹی ٹیوٹ آف اورنٹیل اسٹڈیز، ۶۰۸، کلاں محل، دہلی ۶

جناب عابد رضا بیدار نے اردو کے اہم ادبی اخبارات و رسائل کے اشاریے تین جلدوں میں شائع کرنے کا پروگرام بنایا ہے، یہ اس سلسلہ کی پہلی جلد ہے، اس میں انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے اوائل کے حسب ذیل مجلات و رسائل کی پرانی فائلوں کا محنت اور دیدہ ریزی سے جائزہ لے کر ان کے اشاریے مرتب کیے گئے ہیں

(۱) اخبار سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ (سرسید کا گزٹ)، (۲) اودھ پنچ (منشی سجاد حسین)، (۳) علی گڑھ میگزین (ایم، اے، او کالج اور مسلم یونیورسٹی) (۴) افسر (مولوی عبد الحق) (۵) دکن ریویو (ظفر علی خاں) (۶) تعلیم و تربیت (سید عابد حسین) (۷) مصنف (الطاف علی بریلوی) (۸) معارف (وحید الدین سلیم) (۹) معلومات (سید عابد لوالی) (۱۰) سہیل (رشید احمد صدیقی)

لائق مرتب نے ان رسالوں کے صرف قابل ذکر مضامین اور ان کے لکھنے والوں کے ناموں کی فہرست ہی پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ اہم اور قابل توجہ مضامین کا کسی قدر تفصیل سے

ذکر کیا ہے، اور ان رسالوں ہی کی زبانی ان کے خصوصیات و مقاصد بیان کیے ہیں، بقول مرتب "اردو ادب کے خاصے وقیع اور قابل لحاظ سرمایہ کا ایک بڑا حصہ ابتک ان بھولے بسرے مجلوں میں دفن ہے..... اور کیفیت اور مقدار کے اعتبار سے یہ سرمایہ اردو کے موجودہ کتابی سرمایہ سے کسی طرح کم نہیں"، اس لحاظ سے یہ انڈکس اردو زبان کے طلبہ اور محققین کے لیے بہت کار آمد ہے، مصنف کی اور کتابوں کی طرح اسکی قیمت بھی بہت زیادہ ہے،

نظم سائیکلوپیڈیا - مرتبہ ذکی کاکوروی صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت غنیمت، صفحات ۲۴۲ مجلد قیمت لعہ/ پتہ مرکز ادب اردو، ۱۴۷، شاہ گنج لکھنؤ

جناب ذکی کاکوروی نے غزل سائیکلوپیڈیا کے بعد نظم سائیکلوپیڈیا مرتب کی ہے اس میں قدیم عہد سے لیکر موجودہ عہد تک کے اردو کے نظم گو شعراء کے کلام کا انتخاب کیا گیا ہے، عموماً شعرائے متقدمین و متوسطین کی توجہ نظم کے بجائے دوسرے اصناف سخن خصوصاً غزل کیجانب زیادہ تھی، اس کمی کو پورا کرنے کے لیے ان کے کلام کا کوئی بیانیہ حصہ اس میں شامل کر دیا گیا ہے، لیکن اصلاً اس میں جدید ادب کے معماروں حالی و آزاد اور ان کے بعد کے نظم گو اور موجودہ دور کے ترقی پسند شاعروں کے کلام کی زیادہ نمائندگی ہے، مرتب نے بعض نظم گو شعراء، مثلاً ڈپٹی نذیر احمد وغیرہ کو نظر انداز کر دیا ہے، مگر معروف اور اہم شعراء میں قریب قریب سب کا کلام آگیا ہے، انتخاب کے معاملہ میں لوگوں کا ذوق مختلف ہوتا ہے، مگر مرتب صاحب ذوق شاعر ہیں، اس انتخاب میں بھی انھوں نے حسن مذاق کا ثبوت دیا ہے، دیباچہ میں ایک کے منتخب مجموعوں کو ناقابل ذکر، غیر اہم، سطحی اور گمراہ کن کہنے سے اس مجموعہ کی قدر و قیمت میں

کوئی اضافہ نہیں ہوا۔

ارمغان کیریلا۔ از جناب ایس، ایم سرور صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۸۰ قیمت ۵؍ پیسے۔ پتہ: ایس، ایم سرور صاحب پوسٹ منڈو پرمبا، ملاپرم، کیریلا۔

جناب ایس، ایم سرور صاحب کا وطن ملاپرم، کیریلا اور مادری زبان ملایالم ہے، مگر اردو کی کشش نے ان کو اپنی طرف کھینچ لیا اور وہ اپنی موزونی طبع سے اس میں شاعری بھی کرنے لگے، ارمغان کیریلا ان کے کلام کا مجموعہ ہے، اس میں ۴۲ نظمیں ہیں، جو قومی و ملی درد اور اسلامی جذبات کی ترجمان ہیں، اس لیے ان کے کلام میں اقبال کے افکار و خیالات کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے، لیکن اردو سرور صاحب کی مادری زبان نہیں ہے، اس لیے زبان و طرز ادا میں کہیں کہیں خامی ہے، جو رفتہ رفتہ دور ہو جائیگی، مصنف اس لحاظ سے قابل تعریف ہیں کہ مادری زبان نہ ہونے کے باوجود انھوں نے اردو میں اتنی قدرت حاصل کر لی۔

فضائل علم و مناقب علما،۔ مرتبہ مولانا صدر الدین عامر الانصاری صاحب متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۱۰۲ مجلد مع گرد پوش، قیمت ۳؍ پتہ: ادارہ باب العلوم، مزمل منزل، بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی ۱۳

جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے، اس میں علم دین کی فضیلت و اہمیت اور اہل علم کے مناقب بیان کیے گئے ہیں، پہلے علم و علماء کی فضیلت و منقبت میں وارد قرآنی آیات مع ترجمہ نقل کی گئی ہیں، پھر اس سے متعلق حدیثیں درج کرکے ان کا ترجمہ اور آسان زبان میں انکی تشریح کی ہے، علم دین سے بے اعتنائی اور لاپروائی کے زمانہ میں اس کتاب کی اشاعت ایک مفید دینی خدمت ہے۔

"ض"

جلد ۱۱۰۔ ماہ شعبان المعظم ۱۳۹۲ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۷۲ء۔ عدد ۳

مضامین